تعلیم و تربیت
ستمبر 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
حمد و نعت		2
درسِ قرآن و حدیث	محمد طیب الیاس	3
پرانا چیک	جدون ادیب	4
سبق	صالحہ محبوب	7
پیارے اللہ کے	راشد علی نواب شاہی	11
جنگ ستمبر کے مشہور محاذ	رانا محمد شاہد	13
دماغ لڑاؤ	ادارہ	16
حضرت شاہ حسینؒ / کوپن		17
بوجھو تو جانیں	ننھے قارئین	18
اصول کی پاسداری	عاطر شاہین	19
کھوج لگایئے	ننھے کھوجی	22
آیئے مسکرایئے	ننھے باذوق قارئین	23
اوجھل خاکے	ادارہ	24
میری زندگی کے مقاصد	پُرعزم قارئین	25
مختصر مختصر	ننھے قارئین	26
پرندے کی فریاد	علامہ اقبالؒ	28
بچوں کا انسائیکلو پیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض	29
میری بیاض سے		31
محاورہ کہانی	زبیدہ سلطانہ	32
خوف	کاشف ضیائی	33
ذائقہ کارنر	حاجرہ مرینا خان	36
شیر اور دلیر	سید نظر زیدی	37
دولت پور میں	عزیز اثری	40
آپ بھی لکھیے	ننھے ادیب	47
ایم ایم عالم	غلام حسین میمن	57
فاختہ اور کبوتر	تصور عباس	53
ایڈیٹر کی ڈاک		55
شاہ فیصل مسجد	آفتاب احمد	57
اذان	احمد عدنان طارق	59
نل فائٹنگ	نسرین شاہین	62
بلاعنوان		64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یومِ دفاع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

قوموں کی زندگی میں کٹھن اور آزمائش کے دن آتے رہتے ہیں۔ آزمائش کی ان گھڑیوں میں پورا اُترنے والی قوم کو عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دھرتی کے رکھوالے اور غیرت مند نوجوان جب مادرِ وطن کی طرف دشمن کی میلی آنکھ دیکھتے ہیں تو انہیں اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ نوجوان سوچتے ہیں کہ جب مقصد صرف حق کے پرچم کی سربلندی کا ہو تو اپنے رب سے جان کے بدلے جنت خریدنے کا سودا مہنگا نہیں ہے۔ ان جوانوں کی قوت ایمانی اور جذبہ حب الوطنی کے سامنے فولاد بھی پگھلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور فتح صرف حق کی ہوتی ہے۔

6 ستمبر پاکستانی قوم کے لیے ایک ایسا دن تھا جب پاکستانی قوم نے خود کو دریافت کیا اور انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔ دشمن جس نے رات کے اندھیرے میں ہمارے وطن کے دروازے پر جارحیت کی دستک دی، اسے باور کروایا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ آج سے 49 سال پہلے دشمن نے ہمیں کمزور سمجھ کر رات کی تاریکی میں ہمارے ملک کی سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں پاک فوج کے جوانوں نے بہادری کی ایسی داستانیں رقم کیں اور بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کو ایسی عبرت ناک شکست دی تھی کہ کل عالم دنگ رہ گیا۔ ہمارے عسکری نوجوانوں کے ساتھ ساتھ پوری قوم بھی باطل دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی تھی اور ان کا جذبہ حب الوطنی قابلِ دید تھا۔ سترہ دن کی اس جنگ میں دشمن کو بھاری جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا اور ہماری بہادر افواج نے دشمن کو شکست فاش دی۔ اس شان دار فتح کی یاد میں پوری قوم یہ دن جوش و جذبے اور عقیدت سے مناتی ہے۔

اسی ماہ 11 ستمبر 1948ء کو ہمارے محبوب قائد اور بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ ہم سے جدا ہوئے تھے۔ آپ پاکستانی قوم کے عظیم محسن تھے۔ آپ اور آپ کے رفقاء کی انتھک محنت اور عظیم کوششوں سے ہمیں یہ پیارا وطن پاکستان ملا۔ خدا تعالیٰ ہمارے قائد کے درجات بلند فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام دے (آمین)۔ ان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر پاکستان کو مضبوط اور خوش حال بنائیں۔

ان دنوں آپ کے اسکول بھی گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوبارہ کھل گئے ہوں گے۔ موسم بدل رہا ہے اور گرمی کا زور بھی قدرے کم ہو رہا ہو گا۔ آپ اس بدلتے موسم میں نئے جذبوں، نئی خوشیوں اور لگن کے ساتھ پڑھائی شروع کر دیں۔ اپنی تمام تر توجہ تعلیم اور ملکی ترقی پر مرکوز رکھیں اور کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کریں۔ آپ کی کامیابی اور ترقی کے لیے ہم ہمیشہ دعا گو ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ محسوس کرتے ہوں گے کہ ہم آپ کے پسندیدہ تعلیم و تربیت میں نئی چیزیں متعارف کروا کر آپ کی معلومات اور دلچسپی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہمارے ننھے ساتھی جو ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور جنھوں نے اپنی پسندیدگی اور وابستگی کا گاہے بگاہے اظہار کیا ہے، ہم ان کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ آپ بھی اس میں نیا پن ڈھونڈ کر ہمیں اپنے مشاہدات سے نوازیں۔

اچھا اب اجازت دیں، باقی آئندہ.......... فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر:
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 850 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صفات و ذات میں یکتا تو اے قادرِ مطلق
نہ کوئی تیرا ثانی ہے نہ کوئی مشترک تیرا

کسی کو کیا خبر کیوں خیر و شر پیدا کیا تو نے
کہ جو کچھ ہے خدائی میں وہ ہے لاریب وشک تیرا

تیرے فیض وکرم سے نار ونور آپس میں یک دل ہیں
ثنا گر یک زباں ہر ایک ہے جن و ملک تیرا

فلک: آسمان لاریب: بے شک نار ونور: آگ اور روشنی
ثنا گر: تعریف کرنے والا

نعت رسول مقبولﷺ

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی کل دُنیا کے درباروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دُکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

لولاک: حدیث قدسی لَو لاکَ لَمَا خَلَقتُ الاَفلاکَ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر تیری ذات (رسول اکرم ﷺ) نہ ہوتی تو میں (اللہ تعالیٰ) آسمانوں (کائنات) کو پیدا نہ کرتا۔
جنس: چیز عاقل: عقل مند

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی عیادت کی جن کی آواز بہت ہی زیادہ کم زور ہو گئی تھی اور وہ چوزے کی طرح دبلے ہو گئے تھے۔ (یعنی انتہائی بیمار تھے۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتے رہے ہو؟ (جس کے نتیجے میں یہ بیماری تم پر مسلط ہوگئی۔)''

انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! میں یہ دعا کرتا تھا:

''اے اللہ! مجھے جو کچھ سزا آخرت میں دینی ہو وہ دُنیا ہی میں دے دیجیے۔''

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سبحان اللہ! تم میں اس کی طاقت نہیں ہے، تم نے دعا میں یوں کیوں نہ کہا

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھی اچھائی عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرمائیے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان صاحب نے اس کے بعد یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو شفاء عطا فرما دی۔

(مسلم، کتاب الذکر و الدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب کراہۃ الدعاء بتعجیل العقوبۃ فی الدنیا، رقم: 2688)

پیارے بچو! اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

1- ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت کا سوال کرنا چاہئے اور خود سے کسی مصیبت کو نہیں پکارنا چاہئے۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا، اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے۔ (پھر فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ سے جو چیزیں طلب کی جاتی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے۔'' (ترمذی، ابواب الدعوات: 3548)

2- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سکھائی جس میں دُنیا و آخرت دونوں میں عافیت، بھلائی اور خیر کا سوال ہے اور آخرت کی بڑی مصیبت ''جہنم کی آگ'' سے نجات کا سوال ہے اور یہ دعا، حدیث کے علاوہ قرآن پاک میں بھی مذکور ہے۔

(سورۂ بقرۃ، آیت: 201)

یہ دُنیا و آخرت کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک جامع ترین دعا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے مانگتے تھے۔

(بخاری، کتاب الدعوات، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربنا اتنا الخ، رقم: 6389)

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں خود بھی جب کوئی دعا کرتے تو انہی الفاظ میں دعا کرتے اور جب کوئی خاص قسم کی دعا فرماتے تب بھی وہ یہ دعا ضرور کرتے تھے۔

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنا ایک ایسا عمل ہے جس سے ایک طرف بندے کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور دوسری طرف ''دُعا'' بذات خود ایک عظیم عبادت ہے جس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ اس لیے دعاؤں کا اہتمام کیجیے، خصوصاً اس دعا کا اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت ہی مانگیں۔

☆☆☆

دادا ابو ان دنوں چپ چپ اور پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کے بیٹے اظفر نے دبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ علی کے والد اصغر کا کام دھندا ٹھپ ہو گیا تھا۔ بیگم کی خراب صحت کے باعث ان کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ ان حالات میں دادا ابو کو اس گھر میں اپنا وجود ایک بوجھ کی طرح لگنے لگا تھا۔ علی ان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا مگر وہ کالج میں ہونے کے باوجود اپنے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا تو گھر والوں اور دادا ابو کے لیے کیا کرتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ دبئی میں تایا اظفر کو فون کر کے مالی مدد مانگے مگر پھر جھجک کر رک جاتا کہ اس کا ردعمل کیا ہو گا۔

ایک دن علی کالج سے قدرے لیٹ گھر آیا تو دادا ابو گھر میں نہیں تھے۔ اس نے امی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ پارک میں جانے کا کہہ کر نکلے ہیں۔ امی نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ علی کی امی کہتی ہی رہیں کہ پہلے کھانا کھا لو مگر وہ تیزی سے گھر سے پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔ پارک میں دادا ابو ایک درخت کے نیچے افسردہ حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی کو دیکھ کر ان کے لبوں پہ ایک پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ علی نے ان سے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولے:

''دل نہیں کرتا۔ گھر بیٹھ کر کھانے سے اب حجاب آنے لگا ہے۔''

علی کو بہت افسوس ہوا۔ اس کے دادا ایک بہادر اور غیرت مند انسان تھے مگر آج حالات کے جبر نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔

دادا ابو ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہہ رہے تھے: ''ہمارے ہاں آدمی جب ریٹائرڈ ہوتا ہے یا بوڑھا ہو کر کمانے کے قابل نہیں رہتا تو وہ عضو معطل بن کر رہ جاتا ہے اور صرف گھر کے سودا سلف لانے یا بچے کھیلانے کے قابل رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں بوڑھے لوگ اپنی بلامعاوضہ خدمات، سماجی خدمات فراہم کرنے والے اداروں کو پیش کرتے ہیں۔ وہ بچے سڑک عبور کرانے کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔ جلد بوڑھے ہو کر بستر پر نہیں گرتے، آخری دم تک چست اور مستعد رہتے ہیں۔''

''دادا جان! ہماری اور ان کی ثقافت اور رسم و رواج میں فرق ہے۔ ہمارے ہاں بزرگوں کا کام کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں ابھی تک اخلاقی قدروں کی پاس داری کی جاتی ہے۔ انفرادی طور پر بوڑھے والدین سے زیادتی ہو جاتی ہو گی مگر مجموعی طور پر بزرگوں کو ہمارے گھروں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے جیسے آپ ہمارے فیصلوں کے نگران ہیں۔''

''یار میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔'' دادا حسرت بھرے لہجے میں بولے۔''اصغر کے مالی حالات اچھے نہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرا وجود مفید ہو جائے۔ میں کسی پر بوجھ نہ بنوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' علی تڑپ کر بولا۔''آپ نے اپنی بہترین زندگی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے تیاگ دی اور آج اس اولاد کے لیے بوجھ بن گئے!''

''حالات نے بنا دیا......'' وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

اس دن علی نے انہیں بڑی مشکل سے کھانا کھلایا اور پھر خاص طور پر ان کا خیال رکھنے لگا۔ علی کمپیوٹر کے مختلف کورس کر چکا تھا۔ علاقے میں ایک کمپیوٹر شاپ کی ضرورت تھی جہاں کمپیوٹر درست کرنے کے ساتھ ساتھ سکھانے کا بندوبست بھی ہو۔ علی نے اپنے ابو سے کئی بار ذکر کیا مگر اس کام کے لیے بڑی رقم درکار تھی جو وہ نہیں دے سکتے تھے۔ علی کا خیال تھا کہ وہ دادا ابو کو بھی اپنے ساتھ مصروف رکھ لے گا اور گھر میں اضافی آمدن بھی ہونے لگے گی۔ وہ رقم کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

ایک دن علی، دادا ابو کی کتابیں دیکھ رہا تھا کہ ایک کتاب میں اسے ایک چیک ملا۔ چیک پر مالیت بارہ ہزار روپے لکھی ہوئی تھی مگر تاریخ نہیں لکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ چیک قابلِ استعمال تھا اگر اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم ہوتی۔ وہ خاصے پُرجوش انداز میں چیک لے کر دادا ابو کے پاس آیا مگر انہوں نے چیک دیکھ کر بے نیازی سے کہا:''یہ چیک بہت پرانا ہے، پھاڑ کر پھینک دو۔''

علی نے کسی خیال کے زیرِ اثر چیک پھاڑنے سے گریز کیا اور پوچھا:

''مگر دادا ابو! یہ کس کا چیک ہے؟''

دادا ابو ایک سرد آہ بھر کر بولے:''اچھے وقتوں میں میری عادت تھی کہ دوست یا عزیز و اقارب میں اگر کسی کو مالی مدد درکار ہوتی تو میں ضرور کرتا تھا۔ مجھے خدا نے بے تحاشا نوازا تھا اور سب کچھ اسی کا ہے تو میں اس کے مال کو اس کی رضا کے لیے خرچ کیا کرتا تھا۔ یہ چیک میرے پرانے دوست کے بیٹے نے مجھے دیا تھا۔ اسے باہر کے ملک جانا تھا۔ سارا انتظام ہو گیا تھا مگر ٹکٹ کے لیے پیسوں کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ لڑکا بہت غیرت مند تھا۔ اس نے رقم لے کر مجھے چیک تھما دیا کہ تین ماہ بعد کیش کروا لیں۔ میرا ارادہ چیک واپس کرنے کا تھا لیکن میں نے نہیں کیا اور پھر یہ چیک بھی کھو گیا۔

''دادا ابو! یہ رقم تو آپ کا حق ہے۔ اس سے ہمارے کئی کام ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ میرا مشورہ مانتے ہیں تو ہم بینک سے پتا کرتے ہیں۔ اگر چیک صحیح ہے تو رقم لینے میں کیا حرج ہے۔''

دادا ابو کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:''اچھا تم پہلے پتا تو کر کے آؤ۔''

علی سیدھا بینک پہنچا۔ اس نے مینیجر کو ساری بات بتائی۔ مینیجر نے کیشیئر کو بلوایا اور چیک کیش ہو گیا۔ ایک دم بارہ ہزار کی رقم علی کے ہاتھ آئی تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ وہ مینیجر کا شکریہ ادا کر کے بینک سے باہر نکل رہا تھا کہ سیکیورٹی گارڈ نے اسے روک لیا۔ بینک مینیجر نے اسے دوبارہ بلوایا تھا۔ علی کا دل دھڑکنے لگا کہ کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔

وہ مینیجر کے کمرے میں پہنچا تو وہ کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ فون رکھ کر بولے: ''جناب! چیک کلیئر ہوتے ہی ہمارے کلائنٹ کے پاس میسج چلا گیا اور انہوں نے فون کر کے مجھے کہا کہ میں آپ کو روک لوں۔ وہ آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔''

علی نے بے چینی محسوس کی۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی چلی گئیں۔ پھر ایک ادھیڑ عمر آدمی بینک میں داخل ہوا اور سیدھا مینیجر کے کمرے میں چلا آیا۔

خلافِ توقع وہ بڑے اچھے انداز میں علی سے ملا اور اس کے دادا ابو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑی میں بیٹھے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس شخص نے اپنا تعارف اسلم رضا کے نام سے کرایا۔ وہ ایک بین الاقوامی مائیکروسافٹ کمپنی کا کنٹری مینیجر تھا۔ علی کے دادا ابو سے وہ بڑی گرم جوشی اور احترام سے ملا۔ وہ راستے میں علی سے ساری معلومات اکٹھی کر چکا تھا۔ اس نے دادا ابو کو بتایا کہ انہوں نے بغیر کسی شرط کے اور بغیر جتلائے مطلوبہ رقم اسے دے دی تھی، جس کے بعد وہ باہر جانے میں کامیاب ہو گیا اور آج بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے دادا ابو کا شکریہ ادا کرنے کے لیے انہیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ملے۔

''اب میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کر کے پُرسکون ہو گیا ہوں۔'' وہ مسرور لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے پتا ہے، بے غرض نیکی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، نہ اس کا بدلہ چکایا جا سکتا ہے۔ میرے بیوی بچے دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھتے ہیں۔ آج میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بیٹا بولو!'' دادا ابو مہربان لہجے میں بولے۔

اس نے ایک چیک نکال کر میز پر رکھا۔ ''مجھے آپ کا پوتا علی بہت پسند آیا ہے۔ میرا بیٹا طلحہ اس کا ہم عمر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ معمولی سا نذرانہ آپ علی کے لیے قبول کر لیں۔ اگر وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی کام کر لے تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔''

دادا ابو نے چیک پر نظر دوڑائی۔ وہ ایک لاکھ کا چیک تھا۔ علی خاموشی سے دادا ابو کو دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ بولے: ''بیٹا! تمہارا بہت شکریہ! نوجوانوں کو اپنے دستِ بازو پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں اس بات کا قائل ہوں۔''

''میرے محسن!'' اسلم رضا نے اُٹھ کر دادا ابو کے ہاتھ تھام لیے۔ ''ازراہِ کرم مجھے ایک روحانی خوشی سے محروم نہ کریں۔ رہی بات دستِ بازو آزمانے کی تو میں یہ رقم کاروبار کے لیے دے رہا ہوں۔ امید ہے وہ آپ کے اعتماد پر پورا اترے گا۔''

دادا ابو تذبذب کا شکار تھے۔ آخر اسلم رضا نے حتمی لہجے میں کہا: ''اوکے! میں اپنے الفاظ درست کرتا ہوں۔ یہ نذرانہ یا مدد انعام نہیں ہے۔ قرض ہے، قرض حسنہ......''

دادا ابو نے علی کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ یقیناً اللہ کی مدد تھی اور انکار کفرانِ نعمت تھا۔ انہوں نے چیک اُٹھا لیا۔ اگلے ہی پل تینوں مسکرانے لگے۔

علی کا اپنا کام شروع کرنے کا سپنا پورا ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کئی سال پہلے چیک کیش کروا لیا گیا ہوتا تو صورتِ حال یہ نہ ہوتی۔ بعض کاموں میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت انسان کے لیے کتنی مفید ثابت ہوتی ہے، یہ انسان نہیں جانتا تھا۔ ☆☆☆

6 ستمبر 1965ء کو سابق صدر محمد ایوب خان کا قوم سے تاریخی خطاب

میرے عزیز ہم وطنو، السلام علیکم!

دس کروڑ پاکستانیوں کے امتحان کا وقت آ پہنچا ہے۔ آج صبح سویرے ہندوستانی فوج نے پاکستان کے علاقے پر لاہور کی جانب سے حملہ کیا اور بھارتی ہوائی بیڑے نے وزیر آباد اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی ایک مسافر گاڑی کو اپنے بزدلانہ حملے کا نشانہ بنایا۔ بھارتی حکمران شروع ہی سے پاکستان کے وجود سے نفرت کرتے رہے ہیں اور مسلمانوں کی علیحدہ آزاد مملکت کو انہوں نے کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ پچھلے اٹھارہ برس سے وہ پاکستان کے خلاف جنگی تیاریاں کرتے رہے ہیں۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دل کی دھڑکن میں ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ'' کی صدا گونج رہی ہے، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دشمن کی توپیں ہمیشہ کے لیے خاموش نہ ہو جائیں۔ ہندوستانی حکمران شاید ابھی نہیں جانتے کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ ہمارے دل میں ایمان اور یقین محکم ہے اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہم سچائی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ملک میں آج ہنگامی صورتِ حال کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ دشمن کو فنا کرنے کے لیے ہمارے بہادر فوجیوں کی پیش قدمی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی مسلح فوجوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع عطا کیا ہے۔ میرے ہم وطنو! آگے بڑھو اور دشمن کا مقابلہ کرو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

''ابا! میں نے اسکول نہیں جانا...... ! مجھے سونے دو۔ سویرے سویرے اُٹھا کر بھیج دیتے ہو۔ ماسٹر روز مارتا ہے کہ دیر سے آئے ہو۔ مار بھی کھاؤ اور بے عزتی الگ...... پانچ جماعتیں پڑھ لیں، اب دماغ نہیں چلتا اس پڑھائی میں۔'' کاکا نیند میں تھا اور اُٹھنے کا کوئی پروگرام بھی نہ تھا اس لیے ابے کو بتا کر کروٹ بدل کر دوبارہ کھیس تان کر لیٹ گیا۔

اب چارپائی ہلنے لگی اور کاکا اپنے کھیس اور تکیے سمیت زمین پر آن رہا۔

''ابا! زلزلہ......'' وہ زور سے چیخ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھیس ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی تھا مگر سامنے ابے کی بجائے دادے کو دیکھ کر ساری چیخیں دب گئیں۔ سامنے اس کا دادا غصے میں بھرا کھڑا تھا۔

''اوئے...... اب تُو بڑا ہو گیا ہے۔ اپنے باپ کو جواب دیتا ہے۔ اسکول نہیں جائے گا۔ کیوں...... مار پڑتی ہے؟ لے یہ گھر میں بھی تجھے مار ہی پڑے گی۔ بتا میری مار کھائے گا یا ماسٹر کی۔'' دادے نے اپنی جوتی اُتار کر ہاتھ میں منتقل کی تو کاکے کی جان ہی نکل گئی مگر پھر بھی ہمت کر کے بولا۔

''دادا! تو ہی مار لے......صرف مار ہی کا درد ہو گا ناں! اسکول میں ماسٹر مارے گا تو درد بھی ہو گا اور بے عزتی بھی الگ۔ سارا دن لڑکے میرا مذاق اُڑائیں گے۔'' کاکا زور سے رونے لگا۔

''تو سویرے اُٹھتے تجھے موت آتی ہے۔ سویرے ٹائم پہ اسکول جا تو جوتے نہ پڑیں۔'' دادا جوتا لہرا کر بولا۔

دادا! دیر سے جانے پر مار نہ پڑی تو سبق یاد نہ ہونے پر پڑ جائے گی...... اگر سبق یاد کر لیا تو یونی فارم میلا ہونے پر پڑ جائے گی اور اگر وہاں سے بھی بچ گیا تو یہ والی چپل اسکول پہن کر جانے پر پڑ جائے گی۔ دادا یہ اسکول بنا ہی اس لیے ہے کہ وہاں بچوں کو ماریں اور بے عزتی کریں۔'' کاکا اب مکمل جاگ چکا تھا، اس لیے دادے کو جواب دے رہا تھا۔

''ہیرو صاحب! تو یہ سبق یاد کر لیا کر تا کہ ماسٹر سے مار نہ پڑے اور پیار سے کام چل جائے۔ سبق تجھ سے یاد نہیں ہوتا اور گانے اور ڈانس ایسے آتے ہیں جیسے ماں کی گود ہی سے ٹریننگ لے کر آیا ہے۔ اتنا بڑا ہو کر ابھی تک پانچویں میں بیٹھا ہے۔ تیری دیکھا دیکھی یہ چھوٹا بھی اسکول نہیں جاتا۔ کچھ عقل کر...... پڑھ لے۔ کیا کرے گا ساری عمر؟'' دادا مار پیٹ کے ارادے کو چھوڑ کر کاکے کو سمجھانے لگا۔

"دادا! ہماری تو نسلوں میں کوئی نہیں پڑھا۔ تُو نہیں پڑھا، ابا نہیں پڑھا، یقیناً تیرے ابا اور دادا بھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ بھلا ہم جمع داروں کے گھروں میں کتابوں کا کیا کام؟ اسکول نہیں جانا، ہر سال فیل ہونے سے مجھے بڑا بُرا لگتا ہے۔" کاکے نے فیصلہ سنا دیا۔

دادے نے اپنے قد سے لمبے کاکے کو دیکھا۔ سیاہ کالی رنگت پر لمبے لمبے بال کچھ اس انداز سے بنائے تھے کہ سر پر سیدھے نوکیلے کھڑے تھے۔ ایک کان میں سوراخ کر کے بالی پہنی ہوئی تھی۔ سرخ ٹی شرٹ دل بھر کر میلی تھی اور نیچے پہنا نیکر شاید کبھی پینٹ رہا ہوگا۔ اب وہ گھٹنوں سے نیچے تھا اور خاصا بد وضع بھی...... نیکر کمر سے اس قدر نیچے تھا کہ دادا کو شدید کوفت ہونے لگی۔

"اچھا! تو تیری بے عزتی ہوتی ہے؟ کاکے یہ تیری عزت ہونی کب شروع ہوئی تھی جو بے عزتی بھی ہونے لگی۔" دادا غرّایا۔ غصہ تو اسے ان کانٹے دار بالوں اور لٹکتی ہوئی بالی پہ تھا۔

"دادا! میری عقل موٹی ہے۔ اُستاد کچھ بتاتا ہے، مجھے کچھ اور سمجھ آتا ہے۔ کیا فائدہ یہ وقت ضائع کرنے کا۔ کاکا اپنی چارپائی سیدھی کر کے اس پر دوبارہ سے بیٹھ چکا تھا اور ساتھ ہی اس کا دادا بھی۔

"ہاں! ہاں! دماغ میں گانے بھرے ہوں۔ سارا دن مٹک مٹک کر ڈانس کرتے پاؤں ہوں تو عقل تو موٹی ہو ہی جاتی ہے۔ او بے ہدایتا......!! دو لفظ پڑھ لے گا تو حساب کتاب آ جائے گا۔ ہم سارا ٹبر جاہل...... بجلی کا بل بھی آ جائے تو نکڑ والی دُکان پہ جا کر پڑھواتے ہیں۔ اچھے سے اچھا موبائل رکھا ہے لیکن پتا ہی نہیں چلتا کہ فون کس کا آیا ہے اور چِٹھی کس کی آئی ہے۔ کاروبار کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے۔ دادا اب کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

"دادا! موبائل والی چِٹھی کو میسج کہتے ہیں۔" کاکے نے دادے کی غلطی پکڑی تھی۔

"ہاں! تو تعلیم ہی نے تجھے بتایا ہے ناں یہ سب کچھ۔" دادا پھر بولا۔

"دادا جی! پانچویں تک کی پڑھائی سے مجھے گنتی آ گئی ہے۔ سو سے بھی زیادہ ہزار تک...... جمع تفریق بھی کر لیتا ہوں۔ اب اس سے زیادہ میں نے کون سی مِل کھولنی ہے۔ تیرے ساتھ چائے کے ہوٹل پہ بیٹھوں گا یا اماں اور تیرے ساتھ جھاڑو لگاؤں گا۔ ان دونوں کاموں میں کون سی سائنس لگتی ہے۔ بس جتنا علم چاہیے، اتنا حاصل کر لیا ہے۔ اب مجھے اسکول نہیں جانا۔" کاکا تن کر بولا۔

"اچھا پتر! یوں کر یہ گرمیوں کی چھٹیوں تک تو اسکول جا...... پھر چھٹیوں میں تجھے کام پر لگاؤں گا۔ تین ماہ میں تو دیکھ لینا کہ کون سا کام آسان ہے۔ جھاڑو، ہوٹل، اسکول یا اسکول کا کام۔" دادے کی جہاں دیدہ نگاہیں کاکے کے چہرے پر بغاوت کے آثار دیکھ چکی تھیں۔

"اس معاہدے میں میرے ساتھ منّا بھی شامل ہوگا۔ چوتھی تک تو اس نے بھی پڑھ ہی لیا ہے۔ یہ بھی اب کام کرنا چاہتا ہے، پڑھائی نہیں۔" کاکے نے اپنے سے ایک سال چھوٹے بھائی کا مقدمہ بھی دادا کی عدالت میں پیش کر دیا۔

"اچھا منظور ہے، اب دونوں بھائی اُٹھو۔ تیار ہو کر اسکول جاؤ اور ہاں، یہ اپنے کرنٹ لگے بال سیدھے کرو۔ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے بھوت کہیں جا رہے ہیں۔" دادا گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے تک دونوں لڑکوں کو اسکول جانے پر تیار کر چکا تھا۔ صحن کے کونے میں بنے چولہے پر بیٹھی کاکے اور منّے کی ماں دونوں کے لیے گرما گرم پراٹھے بنا رہی تھی۔ ساتھ میں چائے کی خوش بو بھی صحن میں پھیلی تھی۔ دونوں بچوں کو اسکول بھیجنا دادا اور ماں دونوں کی شدید خواہش تھی۔

یوسف مسیح کا گھرانہ پنجاب کا ایک غریب گھرانہ تھا۔ نسلوں سے اس کا پورا خاندان شہر کی میونسپل کمیٹی میں ملازم تھا۔ اس کے گھر کے عورت مرد سب ہی سرکاری ملازم تھے، جس کی وجہ سے ان کے معاشی حالات خاصے بہتر تھے مگر محلّے میں بچوں کا پڑھائی کی طرف بالکل رجحان نہ تھا۔ انڈین فلموں اور گانوں کا شوقین تو پورا محلّہ تھا۔ تمام عورتیں کاموں سے فارغ ہو کر فلمیں دیکھتیں اور بچے گانوں پر ڈانس کی پریکٹس کرتے۔ سالانہ نتیجے والے دن محلّے بھر کے بچے فیل ہو کر گھروں کو آتے اور ایک کلاس میں دو، دو سال بیٹھے دکھائی دیتے۔

یوسف مسیح کے دونوں بیٹے کمیٹی میں ملازم تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یوسف نے محلّے میں چائے کا کھوکھا کھول لیا تھا۔ سارا دن وہاں چائے بنتی اور ٹی وی چلتا۔ اس کے دونوں پوتے، کاکا اور منّا ہوٹل کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور اسکول سے بھاگنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دو ہفتے باقی تھے اور پھر دادا نے انہیں عملی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دے دی

تھی۔ یوسف کی زندگی کا تجربہ تھا کہ عملی زندگی شروع کرنے کے بعد کبھی کوئی واپس اسکول نہیں گیا تھا۔ ہاں، زندگی کے ہر موڑ پر تعلیم کی کمی پر افسوس ضرور کیا جاتا تھا۔ کاکے نے رو دھو کر دو ہفتے گزارے۔ آخر کار گرمیوں کی چھٹیاں بھی آن پہنچیں۔

''او کاکا......!! او منا......!! اُٹھو سویر ہوگئی ہے۔'' منہ اندھیرے دادا نے آواز دی اور ذرا سی دیر ہونے پر پانی کا بھرا ہوا جگ ان دونوں کے منہ پر اُنڈیل دیا۔ دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''دادا! یہ اتنی سویرے کیا ہوگیا ہے؟'' دونوں حیران ہوئے تھے۔

''پتر یہ سڑکوں پہ جھاڑو کیا دن کے بارہ بجے لگاؤ گے۔ آج اپنی ماں کی جگہ تم دونوں جاؤ گے۔ چلو سائیکل نکالو۔ کاکا سائیکل چلائے گا۔ منا جھاڑو پکڑ کر آگے بیٹھے گا اور میں پیچھے۔'' دادا دونوں کو ساتھ لے کر کام پر روانہ ہوا۔ لمبی سی سڑک اور دُکانیں بند۔ سڑک کی صفائی کر کے مخصوص مقامات پر کوڑا اکٹھا کرنا۔ کاکے کا باپ ٹرالی ڈرائیور تھا اور چاچا کوڑا ٹرالی میں ڈالتا تھا۔ دادا دونوں کے سروں پہ کھڑا ہو کر کام بھی کروا رہا تھا اور کسی غلطی یا سستی کی صورت میں گالیاں بھی دے رہا تھا۔

''ہمارا دادا پچھلے جنم میں یقیناً کوا یا گدھ تھا۔'' کاکے نے منہ میں کہا۔ انڈین فلمیں دیکھ دیکھ کر جنموں کا تصور بچوں کے ذہن میں خاصا پختہ تھا۔ منے نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی اور ابھی جواب دینے ہی والا تھا کہ دادے نے پیچھے سے جلدی کام کرنے کی آوازیں دینا شروع کر دیں۔ دو اڑھائی گھنٹوں میں سڑکیں صاف ہوگئیں۔ پانی والی ٹینکی آکر چھڑکاؤ کر گئی۔ سڑک کے درمیان لگے پودے دھل کر صاف ہو گئے اور دونوں بچے تھکن سے چور۔

''او منڈیو! جلدی ناشتہ کرو، پھر ہوٹل چلیں گے۔'' دادا گھر پہنچتے ہی بولا۔ عملی زندگی کا پہلا دن تو خاصا کٹھن تھا۔

''یہ صفائی دو دفعہ دن میں کرنی ہوتی ہے۔ دوسری دفعہ دن تین سے پانچ بجے تک۔'' دادے سے پہلے اماں نے اطلاع دی جس کی ڈیوٹی اب بچوں نے سنبھال لی تھی۔

سارا دن کے کام اور رات گئے تک ہوٹل میں ڈیوٹی۔ دونوں بھائیوں کی ہمت بالکل ہی جواب دے جاتی تھی۔

''کاکے!! یہ کام تو بڑا مشکل ہے۔ ہم غنڈے نہ بن جائیں۔'' آج نئی فلم دیکھ کر یہ آئیڈیا منے کے دماغ میں آیا۔

''ہاں! یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ غنڈے صبح سے شام تک کام نہیں کرتے۔ صرف رعب جماتے ہیں۔ مگر یہ غنڈے بنتے کہاں ہیں؟'' کاکے نے اپنے ہاتھوں پر بنے چھالے پھوڑتے ہوئے منے سے پوچھا۔

''یہ تو پتا کرنا پڑے گا۔ دادے سے پوچھیں گے۔'' منا بولا کیوں کہ دادے کا علم بہرحال بہت زیادہ تھا۔

''ہاں اور دادا پہلے تو مارے گا۔ پھر پوچھے گا کہ غنڈوں سے کیا کام ہے؟ اپنے ہوٹل پہ وہ جیرا آتا ہے جس سے دادا بھی ڈرتا ہے۔ وہ غنڈہ ہے، اسی سے پوچھتے ہیں۔'' کاکا سمجھ داری سے بولا۔

اگلے روز جیرے سے غنڈہ بننے کا طریقہ دونوں کو کافی مہنگا پڑا۔ مار بھی پڑی، بے عزتی بھی ہوئی اور جواب بھی نہ ملا۔ عملی زندگی تو بڑی مشکل تھی، اس کا ہر سبق دوسرے سے مختلف اور مشقت طلب تھا۔

ماسٹر جی کبھی کبھی شاباش بھی دیتے تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے اور باتیں کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اماں سویرے سویرے پراٹھے اور انڈے کھلاتی تھی اور ساتھ میں روٹی کا ڈبہ بھی دیتی تھی کہ اسکول میں کھا لینا۔ امتحانوں میں دادا دودھ میں بادام ڈال کر خود انہیں پلاتا تھا، اور ابا رات میں مونگ پھلی بھی لاتا تھا کہ بچے پڑھ رہے ہیں اور ان کو طاقت ملے۔ منے کو سب یاد آنے لگا۔

''ہائے! ہائے...... اور اب سارا دن کام کام کام...... دادا کی گالیاں، اماں کی جھڑکیاں، گاہکوں کی آوازیں، ابے کی دھمکیاں اور تو اور، گانوں پر ڈانس کی پریکٹس کا وقت بھی نہیں ملتا۔'' کاکے نے دکھ بھری آواز میں کہا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے میلے کپڑوں میں کہیں جذب ہو گئے۔

''ابا اور دادا میں کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔'' کاکے کو ابا کے موڈ سے اندازہ ہوا۔ ''ابا کمانے کے لیے دبئی جانا چاہتا ہے اور دادا کو دبئی سے جانے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ دادے کے نزدیک یہاں کی سرکاری نوکری کے بہت زیادہ فائدے ہیں۔'' کاکے نے منے کو سارا جھگڑا بتایا۔ ابے نے فلموں میں دبئی بہت دفعہ دیکھا ہے۔ وہ ہر حال میں وہاں جانا چاہتا ہے۔ منے کو بھی کچھ سُن گُن مل چکی تھی۔ دادا نے بیٹے کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پیار سے، طریقے سے، غصے سے...... مگر بیٹے کے دماغ پر دبئی کا بھوت سوار

تھا۔ ایک دن ابا دادے اور اماں سے لڑ کر، ہوٹل کے غلے سے پیسے چرا کر اور اماں کا زیور چرا کر غائب ہو گیا۔ اس نے پورے ایک لاکھ روپے کسی ایجنٹ کو دیے اور اپنا بکسا لے کر غائب ہو گیا۔ دو دن تک گھر میں موت کا سا سناٹا رہا۔ سب چپ تھے، خاموش...... ہوٹل بھی بند تھا اور کاکا اور منا کام پر بھی نہ گئے۔ اماں کو نہ جانے اپنے زیور کا زیادہ افسوس تھا یا ابا کے جانے کا، کھانا پکانا بھی بھول گئی۔ کاکا اور منا سارا دن نہایت افسردہ اور المیہ گانے گاتے رہتے۔

چٹھی نہ کوئی سندیس جانے وہ کون سا دیس
جہاں تم چلے گئے دل کو لگا کر ٹھیس
جانے وہ کون سا دیس جہاں تم چلے گئے

دونوں دل سوز انداز میں گاتے رہے۔ آج نہ دادے نے جھڑکا، نہ اماں نے بلکہ اماں تو دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی رہی۔

ٹھنڈی ہوا سا تھا وہ اُڑتی پتنگ سا تھا وہ
کہاں گیا اسے ڈھونڈو

دوسری تان منے نے لگائی اور کاکا بھی ساتھ شامل ہو گیا۔

سندیسے آتے ہیں مجھے تڑپاتے ہیں
گھر اب سونا سونا ہے

دونوں حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ اماں دھیمی آواز میں گا رہی تھی اور ابے کی فریم شدہ تصویر بھی پیٹی سے نکال کر سامنے الماری میں سجا رہی تھی۔ تیسرے روز سے پھر وہی کام شروع ہو گیا تھا۔ نہ جانے دادا پتھر دل تھا یا اماں سخت دل تھی۔ دونوں کی گانوں پر پریکٹس پھر سے شروع ہو گئی۔ کاکا، منا پھر دادے کے ساتھ تھے۔

دو ہفتوں بعد ابا واپس آن موجود ہوا۔ پھٹے پرانے کپڑے ٹوٹی ہوئی چپل، خالی بکسا، بکھرے بال اور خالی جیب۔ آتے ہی دادے سے معافیاں مانگنے لگا۔ جذباتی فلمی سین کے بعد دادے کو جیسے کچھ یاد آیا۔

''اوئے پتر! تو کس دبئی گیا تھا'' اس نے پوچھا۔

''ابا سب فراڈ تھا۔ ایجنٹ ہمیں کراچی لے گیا۔ وہاں سمندر دکھا کر اور ہمیں ایک لانچ میں بٹھا دیا اور کہا کہ یہ دبئی میں اُتارے گی۔ ہم پڑھے لکھے تو تھے نہیں کہ کوئی پاسپورٹ، ویزا یا ٹکٹ مانگتے۔ دو دن لانچ ہمیں وہیں جزیروں میں گھماتی رہی اور پھر کراچی ہی کے کسی ویران ساحل پہ اُتار دیا۔ ہم دبئی سمجھ کر چل پڑے۔ سامنے اپنے پاکستانی ہی ملے۔ دو دن بعد ہمیں سمجھ آیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ابے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا جس کا ساتھ اماں نے بھی خوب دیا۔ اس کی داستان بے حد دردناک تھی۔

''پتر تمہیں کیا پتا؟ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' اب دادا آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ''مجھے تو وہ دبئی کے چکر میں لاہور لے گئے تھے۔ وہاں جو نمائش والا جہاز ہے نا جو اُڑتا نہیں ہے، وہاں بیٹھا دیا۔ میں اور میرا دوست سارا دن سامان لیے وہاں بیٹھے رہے کہ ابھی جہاز اُڑے گا ابھی اُڑے گا...... اور پھر پولیس والوں نے ہمیں بتایا کہ تمہارے ساتھ تو دھوکا ہوا ہے۔ پتر ہمارے نصیبوں میں جھاڑو ہے جھاڑو...... یہ دبئی ہماری قسمت میں نہیں۔'' دادا اور ابا ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے اور کاکا اور منا بھی۔ آج انہیں نئی باتوں کا پتا چلا۔ علم کے بغیر تو دُنیا میں دھوکا ہی دھوکا ہے۔ بے عزتی ہی بے عزتی ہے۔ مار ہی مار ہے۔

اوئے اٹھو...... دونوں نکمے ابھی تک سو رہے ہو۔ حسب معمول دادا پانی کا جگ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

''دادا! اب ہم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔'' کاکا آنکھیں ملتا اُٹھا۔ منا بھی کسمساتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا مطلب......؟ اوئے کھوتے دے پترو! کون سا فیصلہ......؟'' دادا حیران ہوا۔

''ہم ابھی اسکول جائیں گے۔ پڑھیں گے، پھر کام شروع کریں گے۔'' کاکا بولا۔

''کون سی فلم دیکھی ہے کل جو ایسی سیاست دانوں والی بات کر رہے ہو۔'' دادا حیرت سے بولا۔

''وہی جو کل ہمارے اپنے گھر میں چل رہی تھی۔'' کاکا بولا۔

''دادا اور ابا والی۔'' منا بھی مسکرایا اور بولا۔ دادا خوب زور سے ہنس پڑا، ساتھ میں بہو اور بیٹا بھی۔ پانی کا جگ رکھ کر اس نے دونوں کو گلے سے لگا لیا۔

''شاباش میرے پترو! شاباش یہ ہوئی نا بات!'' دادا دل سے خوش تھا۔ تعلیم، عزت اور اچھی زندگی کا شارٹ کٹ ہے، اس کے دونوں پوتوں نے ان چھٹیوں میں زندگی کا سب سے اہم سبق سیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

اَلْوَاحِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ (اکیلا)

اَلْوَاحِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ ایک ہے اور ہمیشہ سے تنہا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں کئی مرتبہ آیا ہے۔

یہودی لوگ حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے: ''کہو اللہ ایک ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے۔''

اَلْاَحَدُ جَلَّ جَلَالُہٗ (تن تنہا)

اَلْاَحَدُ جَلَّ جَلَالُہٗ ایک ہے، جس کی کوئی مثال نہیں۔ نہ اس کا کوئی وزیر ہے اور نہ ہی کوئی اس جیسا ہے۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ ہی آیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ ایک ہے اسی طرح اس کا نام بھی صرف ایک مرتبہ آیا ہے اور وہ ہے سورۂ اخلاص میں ''قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ''

ترجمہ: ''کہہ دو (بات یہ ہے) کہ اللہ (ہر لحاظ سے) ایک ہے۔''

جب ہم نماز پڑھتے تو التحیات میں اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر پہنچ کر شہادت کی انگلی اوپر اٹھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک انگلی سے، ایک انگلی سے۔'' کیوں کہ جس اللہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ ایک ہے اور اکیلا ہے، لہٰذا اشارہ بھی ایک ہی انگلی سے کرنا چاہیے۔

تپتا صحرا

راستے میں طرح طرح کے ظلم و ستم کا شکار یہ قافلہ کئی جانیں لٹا کر اسلام کے نام پر حاصل ہونے والی سرزمین ''پاکستان'' تک پہنچ چکا تھا۔ طویل سفر کی مشقت سے ہر ایک مسافر کے چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ ہر بوڑھا، جوان، بچے اور عورتیں تھکن سے چُور چُور تھے۔ ہر چہرہ ایک دردبھری داستان سنا رہا تھا۔ اسلام کے لیے گھر بار، چھوڑ کر ہجرت کرنے والوں کا قافلہ لاہور میں داخل ہو چکا تھا۔ تین دن سے کسی کو روٹی کا آدھا ٹکڑا ملا تھا تو کوئی فاقے سے تھا۔ بھوک اور پیاس سے بچے بلبلا رہے تھے۔ ان کو بلبلاتا دیکھ کر بکریوں کے بچے بھی ممیا رہے تھے۔

پندرہ سالہ زینب بھی اس قافلے کی مجاہدہ تھی۔ اس ہجرت میں

اس کے سر سے باپ جیسی ہستی کا سایہ اُٹھ چکا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے شہید باپ کی مبارک لاش آتی تو وہ بلک بلک کر رو پڑتی۔ اس کا بھائی حسن اور ماں فاطمہ اس کے لیے سہارا تھے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کی مدد کے انتظار میں خیمے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

اس کے والد عباس کی باتیں اس کے لیے مرہم کا کام دے رہی تھیں۔ والد کی باتیں اس کی یادداشتوں کے رجسٹر سے گزر گزر کر جا رہی تھیں۔ اس کے والد کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں زخم نہ لگے ہوں۔ زخموں سے نڈھال ہو کر اب وہ راہِ خدا کے شہید بن چکے تھے۔

زینب انہیں یاد کر کے اپنا منہ دوپٹے میں ڈال کر بلک بلک کر رو پڑتی۔ جس آدمی کو دیکھتی اس کے چہرے میں باپ کا چہرہ ہی نظر آتا۔ جس آدمی کی آواز کان میں پڑتی اسے باپ کی آواز ہی لگتی۔

''بیٹی! ان کو سخت گرمی میں دوپہر کے وقت تپتی ریت پر لٹا دیا جاتا اور ان کے سینے پر پتھر کی بڑی چٹان رکھ دی جاتی، تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں۔'' اسے باپ کا سنایا ہوا واقعہ یاد آنے لگا۔

یہ منظر وہ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی تھی۔ کافر اس کے والد کے ساتھ بھی ایسا ہی کر چکے تھے۔ ظالموں نے اس کے والد کو شدید زخمی کر کے ایک بہت بڑا پتھر سینے پر رکھ دیا تھا۔

''ابو! کافر پھر کیا کرتے تھے؟'' اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا تھا۔

''بیٹی! انہیں پھر رات کو زنجیروں سے باندھ کر کوڑے لگائے جاتے۔''

یہ جملہ یاد آیا تو اسے ابو یاد آئے جب ان پر کرپانیں اور پھاؤڑے چلائے گئے تھے۔

''ابو! کافر انہیں کیوں مارتے تھے؟'' یہ اس کا دوسرا سوال تھا۔

''انہیں کافر اس لیے سزا دیتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ایک مان لیا تھا اور کسی بھی بُت کی عبادت کرنے سے انکار کر دیا تھا، یعنی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔''

''اسلام کی خاطر ہمیں بھی قربانی دینی پڑی تو کیا دیں گے؟''

''جی ابو! بالکل!'' وہ پُرجوش انداز میں بولی تھی۔

''جب دوسرا دن آتا تو ان کو پھر تپتی ہوئی گرم زمین پر لٹا کر اور زیادہ زخمی کیا جاتا، تاکہ زخموں کی شدت سے یہ اسلام سے ہٹ جائیں یا تڑپ تڑپ کر مر جائیں، مگر یہ ایک ہی آواز لگاتے احد...... احد۔ (ایک ہے ایک ہے۔) اسلام اور مسلمانوں کا بہت بڑا دشمن ابوجہل تکلیف دیتے دیتے تھک جاتا تو پھر دوسرے ظالم امیہ بن خلف کی باری آ جاتی اور وہ انہیں تڑپاتا۔ جب وہ بھی تھک جاتا تو پھر کوئی تیسرا آ جاتا۔ ہر شخص تکلیف دینے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتا۔ مکہ کے لڑکے ان کے گلے میں رسا ڈال کر کوچوں میں گھسیٹتے۔ یہ ایک غلام تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید کر آزاد کیا۔''

''اسلام کی خاطر اگر ہمیں بھی قربانی دینی پڑی تو کیا دیں گے؟''

''جی ابو! بالکل!'' اسے اپنا پُرجوش جملہ بار بار یاد آتا۔ آج زینب بھی قربانی کے عظیم موڑ پر تھی۔ شاید ابو مجھے ان ہی باتوں کو برداشت کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات سناتے تھے۔ وہ سوچنے لگی۔

''میری بیٹی! حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے سب سے زیادہ ستایا گیا تو پھر انہیں یہ شرف ملا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کے مؤذن بنے۔ یہ خدمت ہمیشہ کے لیے ان ہی کے سپرد ہوئی۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو کعبہ پر چڑھ کر سب سے پہلی اذان بھی انہوں نے ہی دی۔ جن کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے زیادہ ستایا گیا، آج وہی اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

مجھے بھی وہ ایک اللہ تعالیٰ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرح ضائع نہیں فرمائے گا۔ دین کی خاطر قربانیوں کو قبول فرمائے گا۔''

واقعی پھر یہی ہوا کہ زینب کے لیے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ مرہم کی شکل اختیار کر گیا۔ اسے سکون آنے لگا، اسے اپنا غم ہلکا نظر آنے لگا۔ یہ واقعات مستقبل کی زندگی میں اس کے لیے مشعلِ راہ بن گئے تھے۔ کچھ عرصے میں وہ حافظہ قرآن بنی تو سینکڑوں بچیاں اس کے ذریعے سے حافظہ بنیں۔

☆☆☆

6 ستمبر 1965ء کا دن اس لحاظ سے ہماری تاریخ کا نہایت اہم دن ہے جب پاکستان کی مضبوط اور تربیت یافتہ مسلح افواج کے ساتھ ساتھ پوری قوم نے شجاعت و بہادری کی انمٹ داستان چھوڑی۔ اسی دن ہماری بہادر افواج نے اپنی آزادی و قومی وقار کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ تعداد اور اسلحے کی برتری رکھنے والے طاقت ور دشمن کے ناپاک منصوبوں کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ دن یقیناً ہماری قومی تاریخ میں ایک قابلِ فخر دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

سترہ روز تک جاری رہنے والی اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کو تقریباً تمام محاذوں پر ذلت آمیز شکست دی۔

پس منظر

1948ء کی جنگ کشمیر میں مجاہدین نے بھارتی حکومت کو سخت دھچکا پہنچایا۔ جب بھارت کو کشمیری مجاہدین کے سامنے دال گلتی نظر نہ آئی تو اس نے مئی 1965ء میں سخت جارحیت کا مظاہرہ کیا اور آزاد کشمیر میں واقع کارگل کی تین چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان جارحیت کا خواہاں نہ تھا، چنانچہ امن کے پیشِ نظر اقوام متحدہ سے شکایت کی تو بھارت نے چوکیاں خالی کر دیں مگر چونکہ نیت میں فتور تھا، اس لیے 5 اگست 1965ء کو دوبارہ ان پر قابض ہو گیا۔

اس کے بعد بھارت نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیٹوال، اوڑی اور پونچھ کے علاقوں میں مزید اشتعال انگیزی کی اور پھر 24 اگست 1965ء کو ساری حدیں عبور کر دیں۔ ضلع گجرات کے پاکستانی گاؤں اعوان شریف پر بغیر کسی وجہ کے شدید گولہ باری کی جس سے تقریباً 23 افراد شہید ہو گئے۔

بھارتی فوج کی پے در پے اشتعال انگیز کارروائیوں سے پاکستان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو یکم ستمبر 1965ء کو چھمب جوڑیاں کے اہم ترین علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ پاکستانی فوج کے اس اقدام سے بھارتی حکومت بوکھلا گئی اور یوں اس نے بغیر اعلانِ جنگ 6 ستمبر کی صبح پاکستان پر حملہ کر دیا۔

جنگِ ستمبر میں بھارت کو جن اہم محاذوں پر ذلت آمیز شکست ہوئی، ان کی صورتِ حال یہاں بیان کی جا رہی ہے۔

محاذ لاہور

6 ستمبر کی صبح بھارتی فوج نے اعلانِ جنگ کیے بغیر تین اطراف سے لاہور پر حملہ کر دیا۔ بھارتی فوج نے جدید ترین اسلحے

اور بھاری تعداد سے، اس یقین سے حملہ کیا تھا کہ 24 گھنٹوں میں وہ لاہور پر قابض ہوں گے جب کہ اس وقت کے بھارتی وزیر دفاع اور چند فوجی افسروں نے دوپہر کا کھانا اور اسی روز شام کو لاہور جم خانہ میں فتح کا جشن منانے کا پروگرام ترتیب دے رکھا تھا لیکن پاکستان کی فوج کے بہادر سپوتوں نے نہ صرف بھارتی یلغار کو روکا بلکہ انہیں مشہور بی آر بی نہر سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس محاذ پر بھارتی حملہ شدید تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں اس قوم کے ہیرو میجر عزیز بھٹی نے صرف ایک کمپنی کے ساتھ مسلسل کئی روز تک نہ صرف دشمن کی پیش قدمی کو روکے رکھا بلکہ آخرکار اس محاذ پر جامِ شہادت بھی نوش کیا۔ اس کے بعد دشمن نے شاید اس محاذ سے کامیابی کے مصداق فیروز پور روڈ پر بھی پیش قدمی کی اور قصور پر قبضہ کرنا چاہا مگر یہاں بھی پاکستان کی بہادر افواج نے نہ صرف حملہ پسپا کیا بلکہ ہزاروں بھارتی فوجیوں کو گرفتار بھی کیا۔

محاذ کھیم کرن

کھیم کرن کی فتح کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ اس محاذ پر پاکستانی افواج نے اپنے سے کئی گنا بڑی بھارتی افواج کو زبردست شکست دی جس کے نتیجہ میں بھارتی افواج اپنے ٹینک اور اسلحہ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ قصبہ ترن تارا لائن کا ایک اسٹیشن تھا اور بہت خوش حال قصبہ تھا۔ اس محاذ کی اہم بات یہ تھی کہ یہاں سے بے شمار اسلحہ جو امریکہ کی طرف سے بھارت کو دیا گیا تھا، وہ بھی پاکستان کے ہاتھ آ گیا۔ کھیم کرن میں ٹینکوں کی ایک بڑی لڑائی لڑی گئی جس میں بھارت پاکستان کے جوابی حملے میں اپنے ٹینک چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ پاکستان نے بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے کھیم کرن پر قبضہ کرلیا تھا۔

محاذ راجستھان

راجستھان ایک ریگستانی علاقہ ہے۔ چنانچہ بھارت چاہتا تھا کہ پاکستانی فوج کو کارگل سے تھرپارکر تک تقریباً ڈیڑھ ہزار میل لمبی سرحد پر پھیلا کر کمزور کر دیا جائے اور اس کے لیے بہترین علاقہ راجستھان ہی تھا کہ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے فوجی سرگرمیاں مشکل تھیں۔ بھارتی فوج حیدر آباد پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب دشمن حملہ آور ہوا تو یہاں موجود بہادر پاکستانی فوج نے سندھی تحریک حُر کے مجاہدین کے ساتھ مل کر دشمن کو خوب نقصان پہنچایا اور راجستھان میں مونا باؤ ریلوے اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور دشمن کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ حیدر آباد فتح کرنے کا خواب لیے بھارتی فوج اپنے سینکڑوں مربع میل علاقے سے محروم ہوگئی۔

محاذ سیالکوٹ

جنگِ ستمبر میں چونڈہ کے مقام پر ٹینکوں کی جو سب سے بڑی لڑائی لڑی گئی، اسے دوسری جنگِ عظیم کے بعد تاریخ کی سب

سے بڑی لڑائی قرار دیا گیا۔ چونڈہ سیالکوٹ کا ایک نواحی قصبہ ہے، جہاں ٹینکوں کی یہ بڑی لڑائی لڑی گئی۔ اس محاذ پر بھی پاکستان کے ساتھ ساتھ عوام نے بھی شجاعت ومہارت کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن کا عسکری غرور خاک میں مل گیا۔ سیالکوٹ کا یہ محاذ بھارتی منصوبے کا حصہ تھا۔ بھارتی 24 گھنٹے کے اندر چونڈہ سے آگے بڑھ کر سیالکوٹ کے راستے سے ڈسکہ اور گوجرانوالہ پر قبضہ کر کے لائن کاٹ دینا چاہتا تھا مگر پاکستان کی بہادر افواج اور شیر دل عوام نے ان کی فرسٹ انڈین آرمڈ ڈویژن کے ٹینکوں اور ایک تہائی بکتر بند گاڑیوں کو ٹکڑوں میں بدل دیا۔ چونڈہ کے محاذ پر دشمن کے 45 ٹینک اور 17 طیارے تباہ کیے گئے جبکہ 3 ٹینکوں کو قبضہ میں لے لیا گیا۔

فضائی محاذ

7 ستمبر پاک فضائیہ کے لیے ایک سنہری دن ہے۔ بھارتی فضائیہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود پاکستانی فضائیہ کے سامنے ٹک نہ سکی۔ فضائی محاذ کا سب سے اہم معرکہ تاریخ میں آج بھی سنہری حروف سے جگمگا رہا ہے جب بہادر شاہین ایم ایم عالم نے ایک منٹ کے اندر دشمن کے پانچ طیارے تباہ کر دیئے۔ یہ ہوا بازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ پاکستان کے بہادر شاہینوں نے بھارتی فضائیہ کو شدید نقصان پہنچایا اور اس سترہ روزہ جنگ میں 110 بھارتی طیارے، 149 ٹینک، 200 بڑی گاڑیاں اور 20 توپیں تباہ کر دیں۔ اس کے لیے انہوں نے دشمن کے علاقوں ماری پور، جمنا نگر آدم، گورداسپور، ہلواڑہ اور پٹھان کوٹ پر بہادری سے حملے کیے اور شدید نقصان پہنچایا۔ اپنے نقصان کے ردِعمل میں بھارتی فضائیہ نے لاہور، راولپنڈی، سرگودھا اور پشاور کے ہوائی اڈوں کو نقصان پہنچانا چاہا مگر نقصان تو کیا وہ ان کے نزدیک پھڑک بھی نہ سکے۔ اس سترہ روزہ جنگ میں ہمارے شاہینوں نے دشمن کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور اس کے سارے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ پاکستانی فضائیہ نے فضاؤں میں اپنی برتری قائم کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ عالمی میڈیا کو دعوت دے کر جب یہاں بلایا گیا تو وہ بھارتی دعوؤں پر اور پاک فضائیہ کی کامیابی پر حیرت زدہ تھا۔ درحقیقت بھارتی دعوے اس کے روایتی پروپیگنڈے کا حصہ تھے۔

بحری محاذ

پاکستانی بحریہ کا ''آپریشن دوارکا'' کا کارنامہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ پاک بحریہ نے کراچی سے 200 کلومیٹر دُور جنوب کی جانب اور بھارت کے مغربی کاٹھیاوار کے ساحل پر واقع شہر ''دوارکا'' کا مشہور بھارتی بحری اڈہ تباہ و برباد کر دیا۔ اس بحری اڈے پر بھارت کا طاقت ور راڈار سسٹم نصب تھا جہاں سے وہ طیاروں کی نقل وحرکت کو جانچ کر پاکستان کے خلاف ہدایات جاری کرتا تھا۔ اس لیے پاکستانی فوج کے لیے اس کے اس مضبوط راڈار سسٹم کو تباہ کرنا بہت ضروری تھا۔ اس ہوائی اڈے کی تباہی پر بوکھلائی بھارتی بحریہ پاکستانی بحریہ کے ایک یونٹ پر حملہ آور ہوئی تو پاک فضائیہ کی ایک ''غازی'' نامی آبدوز نے ان کے ایک جہاز کو ڈبو دیا اور باقی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کارنامہ بحریہ کے ان افسران کا ہے جو اس وقت پاکستان نیوی کے جہازوں بابر، بدر، عالمگیر، خیبر اور غازی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ پاک بحریہ نے 65ء کی اس جنگ میں ناقابلِ تسخیر عزم وہمت کا مظاہرہ کیا جسے ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ ☆☆☆

دھی اور ذیابیطس

دہی کے بے شمار فوائد ہیں لیکن نئی تحقیق کے مطابق کم چکنائی والا دہی ذیابیطس کو کم کرتا ہے۔ جدید تحقیق 11 سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس تحقیق میں 3,500 برطانوی شہریوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا گیا اور ان پر تحقیق کی گئی۔ تحقیق کے نتیجے میں پتا چلا کہ دہی دیگر اسی قسم کی اشیاء کی بہ نسبت ذیابیطس کے امکانات کو روکنے میں 47 فی صد کام یاب ہے۔ پہلے گروپ کو ناشتے میں 125 گرام دہی دیا گیا جب کہ دوسرے گروپ کو کم چکنائی کا حامل پنیر اسی مقدار میں دیا گیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ دہی لینے والے گروپ میں، دہی نہ لینے والے گروپ کی نسبت ذیابیطس کے امکانات 24 فی صد کم دیکھنے میں آئے۔ لہٰذا پنیر اور دیگر کم چکنائی کی حامل اشیاء کے مقابلے میں ذیابیطس کے امکانات کو روکنے میں دہی زیادہ کام یاب ہے۔ دہی اور دیگر کم چکنائی والی ڈیری پراڈکٹس میں شامل صحت مند جرثومے اور وٹامن K ذیابیطس کے امکانات کو کم کرتے ہیں۔ تحقیق میں موٹاپے اور ذیابیطس کے سلسلے میں فیملی ہسٹری کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ غزوۂ بدر میں کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کتنی تھی؟

i۔ 314 ii۔ 318 iii۔ 313

2۔ "تحیت" کس عمل کو کہتے ہیں؟

i۔ سجدہ ii۔ سلام iii۔ رکوع

3۔ روزمرہ استعمال کی کس چیز کا نام "ویکیوم فلاسک" ہے؟

i۔ جوسر مشین ii۔ تھرموس iii۔ ڈرائر مشین

4۔ قلمی شورہ کسے کہتے ہیں؟

i۔ کاربولک ایسڈ ii۔ پوٹاشیم نائٹریٹ iii۔ ہائیڈرولک ایسڈ

5۔ ایشیائی کھیلوں کا نشان کیا ہے؟

i۔ ہمیشہ آگے بڑھو ii۔ سر اٹھا کر چلو iii۔ صحت اور طاقت

6۔ بحرِ ظلمات سے کیا مراد ہے؟

i۔ بحر اوقیانوس یا اٹلانٹک ii۔ بحر الکاہل iii۔ بحر ہند

7۔ تمرِ ہندی، عربی زبان کا لفظ ہے اس سے کیا مراد ہے؟

i۔ املی یا املی کا درخت ii۔ ہلدی iii۔ کھجور کا درخت

8۔ باب الاسلام پاکستان کے کس علاقے کو کہا جاتا ہے؟

i۔ سندھ ii۔ بلوچستان iii۔ پنجاب

9۔ فٹ بال میچ کے دوران ریفری کے پاس سیٹی، پنسل، سکہ، گھڑی اور فٹ بال کے علاوہ کس چیز کا ہونا ضروری ہوتا ہے؟

i۔ چھتری ii۔ نوٹ بک iii۔ رومال

10۔ عظیم سندھی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا مجموعہ کیا کہلاتا ہے؟

i۔ شاہ جو رسالو ii۔ ابیات سندھی iii۔ دیوانہ گل

جوابات علمی آزمائش اگست 2014ء

1۔ شیشہ 2۔ آگ کا درجۂ حرارت 3۔ چمن 4۔ واٹر للی 5۔ تلی 6۔ چاند گرہن کے وقت 7۔ ریسلنگ 8۔ ٹیکسلا دو صوبوں کے درمیان ہے 9۔ قسطنطنیہ 10۔ ترانہ ملی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ صبیحہ بابر، اسلام آباد۔ (150 روپے کی کتب)

☆ قاسم رحیم گل، لاہور۔ (100 روپے کی کتب)

☆ فرحین امین، گوجرانوالہ۔ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

محمد مہدی اکبر غوری، بھکر۔ فاطمہ فرحین، بہاول پور۔ حمنہ طارق، لاہور۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ روحین زمان، کرک، خیبر پختونخواہ۔ ریشا نور، اسلام آباد۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ عبداللہ ایان شیخ، شہداد پور۔ فائز محمد فاروق، کراچی۔ محمد شادمان صابر، لاہور۔ زینب شریف کاہلوں، فیصل آباد۔ عریشہ بنت حبیب الرحمٰن، کراچی۔ سید ایان زخمی، دریا خان۔ صوفیہ عبداللہ، پشاور۔ صباحت احمد، لاہور۔ علینہ عامر، فیصل آباد۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ حفصہ اویس، راولپنڈی۔ حافظ ثناء عروج، فیصل آباد۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ محمد ضیاء اللہ، شمائلہ ناز، میانوالی۔ اقراء عرفان، رمشہ عرفان، سرگودھا۔ فاطمہ اعتزاز، اٹک۔ نایاب آفریدی، پشاور۔ خدیجہ رباب واسطی، گوجرانوالہ۔ ضحیٰ بدر، لاہور۔ محمد افضل انصاری، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاولپور۔ شانزے عزیز، صوابی۔ حافظ محمد منیب، وزیرآباد۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ طٰہٰ یاسین، حیدر آباد۔ احمد یار، لاہور۔ محمد زبیر عبیداللہ، خانقاہ ڈوگراں۔ رانا کلیم، بھکر۔ مسٹر محمد اکرم صدیقی، میانوالی۔ انشراح سلیم، لاہور۔ محمد عبداللہ ثاقب۔ مہر اکرم، لاہور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ انعام الحق، اسلام آباد۔ اقراء صدیق، لاہور۔ سلیمان صدیقی، بھکر۔ عائشہ نور، جہلم۔ منیب الرحمٰن، ملتان۔ شازیہ انور، خانیوال۔ احسن اقبال، حیدر آباد۔ فاطمہ ظہور، لاہور۔

حضرت شاہ حسینؒ : شاہ حسین ایک پنجابی شاعر تھے۔ شاہ حسین کو مادھو لال کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شاہ حسین 1539ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ہندو تھے لیکن والد حلقۂ بگوش اسلام ہوئے اور نام شیخ عثمان رکھا گیا۔ لاہور کے ٹیکسالی دروازے میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہ زمانہ مغلیہ سلطنت کے مرکزی علاقوں میں احیائے دین کی تحریکوں کا زمانہ تھا۔ شاہ حسین کے گھرانے میں ہندو ثقافتی اور مذہبی اثرات بدستور موجود تھے۔ شاہ حسین پیشہ کے اعتبار سے بافندے تھے اور انھوں نے اپنے اس طبقاتی پس منظر کا کھلے دل کے ساتھ اظہار بھی کیا۔ چنیوٹ کے قادری صوفی شیخ بہلول نے انہیں اپنے حلقے میں شامل کر لیا اور شاہ حسین کے شب و روز عبادتوں اور ریاضتوں میں بسر ہونے لگے۔ یہ سلسلہ چھتیس برس جاری رہا۔ انہی دنوں شیخ سعد اللہ نامی ایک ملامتی درویش لاہور آ نکلے۔ وہ کامل ملامتی تھے۔ شاہ حسین نے ان کی صورت میں جب بغاوت کو مجسم دیکھا تو ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کی صحبت میں شاہ حسین مدہوش ہوتے گئے۔ شیخ بہلول حدود سے اس حد تک تجاوز کو پسند نہ کرتے تھے مگر شاگرد ''اصلاح'' کے مقامات سے گزر چکا تھا۔ وہ رقص کرتے، وجد میں رہتے، دھمال ڈالتے اور لال رنگ کے کپڑے پہنتے۔ اسی بناء پر لال حسین کے نام سے مشہور ہو گئے اور اپنے حال میں مست رہے۔ ان ہی دنوں ایک براہمن زادے نے ان کی خوداعتمادی، خود پرستی اور حق شناسی کے آئینے کو ایک ہی نظر میں چور چور کر دیا۔ شاہ حسین اس کے پیچھے ہو لیے۔ کئی برس اسی تعلق میں گزار دیئے۔ بالآخر حسین کا معرکہ عشق کی کامیابی پر ختم ہوا اور مادھو نے اپنا دین ایمان دوست پر نچھاور کر دیا اور زندگی ان کی دل جوئی کے لیے وقف کر دی۔ عشق حقیقی میں ڈوبی ہوئی یہ آواز ایک درویش صفت اور مست الست انسان کی آواز ہے جو آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے خطہ پنجاب میں گونجی اور پھر دیکھتے دیکھتے پاک و ہند میں پھیل گئی۔ شاہ حسین پنجاب کے ان سرکردہ صوفیاء میں سے ہیں جنہوں نے برصغیر میں خدا کی وحدانیت کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ پنجاب کے چند صوفی دانشوروں کی طرح حسینی فکر بھی عقل کی جگہ حس پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔ شاہ حسین نے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا اور موسیقی آمیز شاعری کے ذریعے اپنے افکار و نظریہ کو خاص و عام میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ صوفیانہ اظہار کی یہ صورت بعدازاں پنجاب کی شاعری میں ایک صنف بن گئی۔ وہ صاحب حال صوفی تھے۔ ان پر جو کیفیات گزرتیں، سادہ زبان میں بیان کر دیتے۔ قوتِ مشاہدہ کی بدولت ان کی شاعری کے سادہ الفاظ میں گہرے معنی پائے جانے لگے اور ان کی کافیوں میں استعمال کیے گئے عام الفاظ علامتوں کا روپ دھارنے لگے۔ شاہ حسین کی روز مرہ زندگی، ملامتی زندگی میں رچی ہوئی تھی۔ ان کے مطابق طالب اور مطلوب کے درمیان رابطے کے لیے کسی تیسری ذات کی موجودگی اور اس کا فعال تعاون بے حد ضروری ہے۔ تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ مغلیہ حاکموں کی بہت سی بیگمات اور شہزادیاں شاہ حسین کو اپنا بزرگ مانتی تھیں مگر شاہ حسین شاہی خانوادے کے اس التفات سے بے نیاز تھے اور اپنے ڈھنگ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لاہور میں برس ہا برس تک درویشانہ رقص و سرور کی محفلیں آباد کرنے کے بعد یہ درویش 1599ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی قبر اور مزار لاہور کے شالیمار باغ کے قریب باغبان پورہ میں واقع ہے۔ ہر سال میلہ چراغاں کے موقع پر ان کا عرس منایا جاتا ہے۔

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2014ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2014ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

ستمبر کا موضوع ''فوجی پریڈ'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 ستمبر 2014ء ہے۔

نام ________ عمر ________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

1- دن کو سوئے رات کو روئے
جتنا روئے اتنا کھوئے

2- ہری ڈنڈی لال کمان
توبہ توبہ کرے پٹھان
(حمنہ عاشق، لاہور)

3- دیکھو یہ کیسا شیطان
ناک پہ بیٹھے پکڑے کان

4- ایک درخت کی پانچ ٹہنیاں
دو پہ دھوپ، تین پہ چھاؤں
(سحر فاطمہ، لاہور)

5- دُور پہاڑ پر سے آئے
گھر میں آ کر گھل مل جائے

6- جس کے پاؤں کے نیچے وہ آئے
کانوں کو وہ ہاتھ لگائے

7- یقیناً بزدل ہے جس نے کھایا
بہادر وہ جس نے پی کر دکھایا
(ملائکہ رانی، جھنگ)

8- اس کے ہوتے کچھ نہ کھایا
کھایا جب اس کو نہ پایا

9- ایک بڈھے کے سر پر آگ
گاتا تھا وہ ایسا راگ
اس کے منہ سے نکلیں ناگ
تیزی سے جائے بھاگ

10- راجا کے راج میں نہیں
چھیلو تو چھلکا نہیں
(عدن سجاد، جھنگ صدر)

جوابات: 1۔موم بتی 2۔مرچ 3۔عینک 4۔نمازیں 5۔نمک
6۔جائے نماز 7۔غصہ 8۔روزہ 9۔حقہ 10۔اولے

راستہ بتایئے:

نقطے ملایئے اور رنگ بھریئے:

ارسلان کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بی اے کا طالب علم تھا۔ وہ دو بہن بھائی تھے۔ وہ بڑا تھا جب کہ اس کی بہن اس سے چار سال چھوٹی تھی اور میٹرک کی طالبہ تھی۔ ارسلان کا تعلق ایک متمول گھرانے سے تھا۔ اس کے والد عاصم سیال محکمہ پولیس میں ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ باا ثر انسان تھے لیکن اصولوں کے پابند تھے۔ انہوں نے کبھی اصول کے خلاف کام نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے محکمے میں ایمان دار آفیسر کے نام سے مشہور تھے۔

ایک دن ارسلان کار پر سوار اپنے گھر جا رہا تھا۔ گاڑی میں ایئرکنڈیشنر آن تھا۔ ارسلان کا سیل فون کار کے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اسی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے سیل فون اُٹھا کر سکرین پر دیکھا تو اس کے دوست مظہر کا نام فلیش ہو رہا تھا۔ اس نے یس کا بٹن پریس کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلومظہر! کیسے ہو؟'' ارسلان نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کہاں ہو ان دنوں کالج بھی نہیں آ رہے؟'' دوسری طرف سے اس کے دوست مظہر کی آواز سنائی دی۔

''کچھ دنوں سے میری طبیعت خراب تھی، اس لئے کالج نہیں آ رہا لیکن کل سے آؤں گا۔ تم سناؤ! آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' ارسلان نے جواب دیا۔ وہ اس وقت سڑک پر چوک میں موجود تھا۔ سگنل آن تھا لیکن ارسلان باتیں کرتے ہوئے سگنل توڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ چوک کے ایک طرف دو ٹریفک وارڈن کھڑے تھے۔ انہوں نے جب ارسلان کو سگنل توڑتے دیکھا تو ایک وارڈن موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور ارسلان کی کار کے پیچھے آنے لگا۔ ارسلان نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

''کوئی خاص کام نہیں۔ تم کافی دنوں سے کالج نہیں آ رہے تھے، اس لئے میں نے سوچا کہ میں تمہاری خیریت ہی معلوم کر لوں۔'' مظہر نے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ ارسلان اس کی بات کا کوئی جواب دے پاتا، اسی لمحے وارڈن اس کی کار کے آگے پہنچ گیا اور اسے کار روکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ارسلان چونک پڑا۔

''اچھا مظہر، میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں، اللہ حافظ!'' ارسلان نے کہا اور سیل فون آف کر کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ اس نے کار بھی سڑک کے کنارے پر روک لی تھی۔ ٹریفک وارڈن بھی موٹر سائیکل روک چکا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے اُتر کر اس کی طرف آنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں چالان کی کاپی تھی۔ ارسلان نے اپنی سائیڈ والے دروازے کا شیشہ نیچے کر لیا۔

''آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟'' ارسلان نے وارڈن سے پوچھا۔

''آپ گاڑی کے کاغذات اور لائسنس لے کر گاڑی سے باہر آ جائیں۔'' وارڈن نے جواب دیا۔

''کیوں...... کیا مجھ سے کوئی جرم ہو گیا ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''جی ہاں! آپ سے ایک نہیں، دو جرم ہوئے ہیں۔'' وارڈن نے جواب دیا تو ارسلان کے چہرے پر حیرت کے تاثرات اُبھر آئے۔

''میں نے دو جرم کیے ہیں...... کیا مطلب؟'' ارسلان نے کہا۔

''آپ گاڑی کے کاغذات اور لائسنس لے کر باہر تو آئیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ نے کون سے دو جرم کیے ہیں۔'' وارڈن نے کہا تو ارسلان نے بُرا سا منہ بنایا۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کھول کر کار کے کاغذات اور اپنا لائسنس بک اُٹھائے اور کار سے باہر نکل آیا۔ اس نے کاغذات اور لائسنس بک وارڈن کے حوالے کر دیئے تو وارڈن انہیں چیک کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وارڈن نے لائسنس بک ارسلان کو واپس کر دی جب کہ کار کے کاغذات اپنے پاس رکھ لیے۔

''آپ نے کاغذات کیوں اپنے پاس رکھ لیے ہیں؟'' ارسلان نے بے زار سے لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے کہ میں آپ کی کار کا چالان کر رہا ہوں۔'' وارڈن نے کہا اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چالان بک کھولی اور پوائنٹر سے اس پر کچھ لکھنے لگا۔

''آپ میرا چالان کیوں کر رہے ہیں جب کہ میری کار کے کاغذات اور لائسنس مکمل ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

''محترم! میں نے آپ کو بتایا ہے کہ آپ نے دو جرم کیے ہیں۔ پہلا جرم، آپ نے ٹریفک سگنل توڑا ہے۔ اگر خدانخواستہ دوسری طرف سے کوئی گاڑی آ جاتی تو ایکسیڈنٹ ہو سکتا تھا۔ دوسرا جرم یہ کہ دورانِ ڈرائیونگ موبائل فون سننا منع ہے، آپ موبائل پر باتیں کرتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ اس لیے میں آپ کی کار کا چالان کر رہا ہوں۔'' وارڈن نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا تو ارسلان کو احساس ہوا کہ واقعی اس سے یہ دونوں جرم سرزد ہوئے ہیں۔ دورانِ ڈرائیونگ موبائل فون سننا منع ہے، وہ مظہر سے باتیں کرتے ہوئے اس نے سگنل پر بھی توجہ نہیں دی تھی اور سگنل توڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، مجھ سے یہ دونوں جرم ہوئے ہیں لیکن پلیز آپ چالان نہ کریں۔'' ارسلان نے کہا۔

''کیوں، میں چالان کیوں نہ کروں؟'' وارڈن نے چونک کر کہا۔

''کیا آپ مجھے جانتے نہیں ہیں؟'' ارسلان نے کہا۔

''نہیں، میں آپ کو نہیں جانتا۔ ویسے بھی آپ کا تعلق جس کسی بھی گھرانے سے ہو، میں قانون پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔'' وارڈن نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا اور پھر وہ دوبارہ چالان بک پر لکھنے لگا۔

''ٹھہریں! میں آپ کو اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔ میرا نام ارسلان ہے اور میں ڈی آئی جی عاصم سیال کا بیٹا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''پھر میں کیا کروں۔ آپ چاہے وزیراعظم کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، قانون سب کے لیے برابر ہے۔ آپ نے جرم کیا ہے تو آپ کی کار کا چالان بھی ہو گا۔'' وارڈن نے کہا تو ارسلان کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھر آئے۔

''آپ کیوں اپنی نوکری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاپا کو معلوم ہو گیا تو وہ آپ کو نوکری سے نکلوا سکتے ہیں۔'' ارسلان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''مجھے نوکری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' وارڈن نے جواب دیا اور پھر اس نے چالان بک سے ایک ورق پھاڑ کر ارسلان کے حوالے کر دیا تو ارسلان غصے سے کھولتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا اپنا سیل فون اُٹھایا اور اپنے ابو کو کال کرنے لگا۔

''ہیلو پاپا! میں ارسلان بول رہا ہوں۔'' رابطہ ہوتے ہی ارسلان نے تیز لہجے میں کہا۔

''یس بیٹا! کیا بات ہے، تم پریشان لگ رہے ہو؟'' دوسری طرف سے اس کے والد ڈی آئی جی عاصم سیال کی آواز سنائی دی۔

''پاپا! میری ہیلپ کریں۔''

''کیا ہو گیا ہے بیٹا...... مجھے بتاؤ؟''

''پاپا! آپ کے محکمے کے ایک وارڈن نے میری کار کا چالان کر دیا ہے۔'' ارسلان نے بتایا۔

''بیٹا! آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہو گی۔'' ارسلان کے پاپا نے کہا۔

''جی ہاں، پاپا! میں ڈرائیونگ کے دوران اپنے دوست مظہر سے فون پر بات کر رہا تھا اور میں سگنل توڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

ٹریفک وارڈن نے مجھے روک لیا۔ میں نے اپنا تعارف بھی وارڈن سے کرایا کہ میں ڈی آئی جی ٹریفک عاصم سیال کا بیٹا ہوں لیکن اس کے باوجود اس نے میرا چالان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں وزیراعظم کا بیٹا بھی ہوتا تو پھر بھی وہ ضرور چالان کرتا۔ پاپا! اس نے آپ کی توہین کی ہے، اس لیے آپ فوراً اس وارڈن کو نوکری سے نکلوا دیں۔'' ارسلان نے تیز تیز لہجے میں کہا۔

''ارسلان بیٹا!'' چند لمحوں کے بعد ارسلان کے والد کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''وارڈن نے میری کوئی توہین نہیں کی بلکہ اس کا جو فرض تھا اس نے وہ فرض نبھایا ہے۔ وہ محبِّ وطن انسان ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ میرا نام سن کر تمہاری کار کا چالان نہ کرتا لیکن میں اس وارڈن کو سلام پیش کرتا ہوں جس نے کسی سفارش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے...... باقی رہی اسے نوکری سے نکلوانے کی بات تو میں ایسا نہیں کروں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں اصول کا پکا ہوں۔ میں اپنی گردن تو کٹوا سکتا ہوں مگر اپنے اصول نہیں توڑ سکتا۔ اگر تم ڈی آئی جی کے بیٹے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لو اور جو چاہے مرضی کرو۔ تمہیں پوچھنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ سوری بیٹا! میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم نے دو جرم کیے ہیں، اس لئے تمہیں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا چاہیے۔''

دوسری طرف سے اس کے پاپا عاصم سیال کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا لیکن ارسلان ساکت و جامد کھڑا رہا۔ اس کے پاپا کے الفاظ بازگشت بن کر اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اس نے وارڈن کی طرف دیکھا تو وہ موٹر سائیکل پر بیٹھا جا رہا تھا۔ ارسلان نے سیل فون اپنی پتلون کی جیب میں رکھا اور چالان کی چٹ ہاتھ میں تھامے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ ☆☆☆

''کھوج لگائیے'' میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبداللہ ایان شیخ، سانگھڑ۔ ندا افضل، منڈی بہاؤ الدین۔ عائشہ مجید، لاہور کینٹ۔ اقصیٰ شہزادی، گوجرانوالہ۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ اُشنہ ندیم، گوجرانوالہ۔ عارفہ شیخ، کوٹری سندھ۔ طلحہ سلمان، لاہور۔ محمد شادمان صابر، لاہور۔ نوشیرواں ملک، لاہور۔ اسد امین، گوجرانوالہ۔ عائشہ مریم، کوہاٹ۔ صبیحہ بابر، اسلام آباد۔ سید تحسین حیدر کاظمی، سرگودھا۔ فاطمہ فرحین، بہاول پور۔ تحریم شکیل، اسلام آباد۔ حافظ زعیمہ سلطانہ، لاہور۔ گلفرین محمد اسماعیل، فیصل آباد۔ عریشہ بنت حبیب الرحمٰن، کراچی۔ محمد انس نورانی، گوجرانوالہ۔ عادل عاصم، منڈی بہاؤ الدین۔ عادل عاصم، منڈی بہاؤ الدین۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ میمونہ خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ اریبہ عامر، لاہور۔ دانیہ نوید ملک، لاہور۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ محمد عثمان علی، بھکر۔ علی خان، پشاور۔ عبدالشاہد، کوہاٹ۔ محمد ضیاء اللہ، شمائلہ ناز، میانوالی۔ معیز اعتزاز، اٹک۔ حرا بتول، فیصل آباد۔ نایاب آفریدی، پشاور۔ محمد طلحہ سلمان، لاہور۔ کشف طاہر، لاہور۔ عبداللہ سلیم، فیصل آباد۔ حرا ظفر، گوجرانوالہ۔ حفصہ اویس، راول پنڈی۔ صدف ندیم، رحیم یارخان۔ حسیب الرحمٰن، شیخوپورہ۔ فائزہ بابر خان، راولپنڈی۔ محمد احمد شاہد، لاہور۔ اریج عزیز الرحمٰن، گوجرانوالہ۔ صباحت احمد، لاہور۔ سنینہ طارق، لاہور۔ قاسم رحیم گل، لاہور۔ حبیبہ الفت، لاہور۔ مومنہ حمید، گوجرانوالہ۔ محمد ابوبکر صدیقی، لاہور۔ احمد یار، لاہور۔ وجاہت رسول، بہاول پور۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ ایشع طارق، گوجرانوالہ۔ محمد مہدی اکبر غوری، بھکر۔ آریز احسان، لاہور۔ رانا کلیم، بھکر۔ محمد زبیر عبید اللہ، شیخوپورہ۔ حذیفہ سلیم، لاہور۔ مرزا ہادی بیگ، حیدرآباد۔ مہر اکرم، لاہور۔ طلحہ فاروق، راول پنڈی۔ صفا رشید، کراچی۔ طٰہٰ طیب، گوجرانوالہ۔ نوریہ مدثر، سیالکوٹ۔ صوفیہ عبداللہ، پشاور۔ عائشہ سعید، راہوالی۔ عزام عبداللہ، لاہور۔ حافظ محمد منیب، وزیرآباد۔ موحد مکرم، راہوالی۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ فاطمہ ظہور، لاہور۔ موسیٰ بن ارفع، لاہور۔ جنید بشیر، راہوالی۔ باری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ عمر نذیر، ساہیوال۔ محمد اورنگ زیب خان نیازی، میانوالی۔ محمد علیان جاوید، سرگودھا۔ احسن آفاق، کراچی۔ طیبہ نور، گوجرانوالہ۔ حنا مشتاق، سیالکوٹ۔ وقار صادق، راولپنڈی۔ صبا نور، حیدرآباد۔ عبدالمقیت عزیز، لاہور۔ اریبہ سلیمان، خانیوال۔ معروشہ عزیز، فیصل آباد۔ عدیل عارف، جہلم۔ سونیہ سلیم، پشاور۔ محمد اکرام، قصور۔ محمد ندیم، کراچی۔ سمعیہ افضل، اسلام آباد

آج اسکول میں پہلا دن تھا۔ سالانہ امتحان کے بعد سب بچے بہت خوش اور پُرجوش تھے۔ نئے بستے اور کتابیں سنبھالے سب بچے اپنے کمرۂ جماعت میں داخل ہوئے۔ کمرۂ جماعت بہت صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ دیواروں پر رنگ برنگے اور معلوماتی چارٹس تھے۔ دیوار پر کالی سیاہی کی طرح چمکتا بلیک بورڈ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سب بچے اپنے اپنے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد استانی صاحبہ بھی اندر داخل ہوئیں۔ سب بچے کھڑے ہو گئے، سلام کیا اور دوبارہ اپنے اپنے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ استانی صاحبہ نے بہت پیار اور شفقت سے سلام کا جواب دیا۔ استانی صاحبہ بچوں سے مخاطب ہوئیں۔

پیارے بچو! آج آپ کا پہلا دن ہے۔ ہماری جماعت میں کل 11 بچوں کی حاضری مکمل ہوئی ہے۔ ہر بچہ دوسرے بچے سے ہاتھ ملائے گا۔ آپ بتائیں جماعت میں کل کتنی مرتبہ ہاتھ ملایا جائے گا۔

اگست 2014ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگایئے'' کا صحیح جواب یہ ہے:

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق قاسم ایک گھنٹے میں تینوں گولیاں کھا لے گا۔

اگست 2014ء کے کھوج لگایئے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- سمیہ نوید، لاہور
2- حامد علی، لاہور
3- لائبہ مریم، رحیم یار خان
4- لائبہ فضل خان، لاہور
5- حریم فیاض، گوجرانوالہ

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''اگر میں ہمالیہ کے پہاڑ پر چڑھ جاؤں تو کیا انعام دو گے۔''
دوسرا دوست (معصومیت سے): ''دھکا۔'' (سحر فاطمہ، لاہور)

فقیر نے بھکاری سے کہا: ''تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟''
بھکاری نے جواب دیا: ''یہ دیکھنے کے لیے کہ اس دُنیا میں کون سخی ہے اور کون کنجوس۔''

☆

ایک بچہ رو رہا تھا۔ باپ نے رونے کی وجہ پوچھی تو بولا: ''پہلے پانچ روپے دیں، پھر بتاؤں گا۔'' باپ نے فوراً پانچ روپے دیے اور بولے: ''اب بتاؤ کیوں رو رہے تھے؟''
بچہ بولا: ''اسی پانچ روپے کے لیے رو رہا تھا۔''

☆

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''یار آپ نے تین تین عینکیں کیوں رکھی ہوئی ہیں۔''
دوسرا دوست: ''ایک قریب کے لیے، دوسری دُور کے لیے اور تیسری ان دونوں کو تلاش کرنے کے لیے۔'' (عبداللہ شاہ، دریا خان)

احمد (ابا سے): ''ابا جان، مجھے نئے جوتے چاہئیں۔''
علی (ابا سے): ''ابا جان وہ تو مجھے بھی چاہئیں۔''
حماس (ابا سے): ''مجھے بھی چاہئیں۔''
ابا (بچوں سے): ''تم سب جوتوں کے مستحق ہوں۔''
(نور فاطمہ، لاہور کینٹ)

ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا: ''آپ مریض کے گھر جا کر چیک کرنے کے کتنے پیسے لیتے ہیں؟''
ڈاکٹر نے کہا: ''150 روپے۔''
وہ جلدی سے ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ جب گھر آیا تو جلدی سے اُتر گیا۔
ڈاکٹر نے کہا: ''مریض کہاں ہے؟''
وہ آدمی بولا: ''مریض تو نہیں ہے، البتہ ٹیکسی والا 400 روپے مانگ رہا ہے۔'' (افراح اکبر، لاہور)

اُستاد (شاگرد سے): ''تم جنت میں جانا چاہتے ہو؟''
شاگرد: ''نہیں، جناب میری امی نے کہا ہے کہ اسکول سے سیدھے گھر آنا۔''

☆

استاد (ارشد سے): ''تم اسکول دیر سے کیوں آئے ہو؟ تمہیں پتا ہے اسکول ساڑھے سات بجے شروع ہو جاتا ہے۔''
ارشد: ''جناب! آپ اسکول شروع کر دیا کریں، میرا انتظار نہ کیا کریں۔'' (تحریم وقار)

ایک صاحب نے کسی کو فون کیا۔ فون میں سے آواز آئی: ''آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے، برائے مہربانی کچھ دیر بعد فون کریں۔''
وہ صاحب جلدی سے بولے: ''باجی! اس کو یاد سے بتا دینا، گل خان کا فون آیا تھا۔''

☆

ایک آدمی سے کسی نے پوچھا: ''یہ بتاؤ کہ عقل بڑی یا بھینس؟''
وہ صاحب تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر بولے: ''پہلے دونوں کی تاریخ پیدائش بتاؤ؟'' (ایمن، صوابی)

استاد: ''امتحان نزدیک ہے، کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔''
شاگرد: ''بہت بہت شکریہ سر! بس یہ بتا دیں، پرچے میں کون کون سے سوالات آ رہے ہیں۔'' (جواد، صوابی)

ایک صاحب (دوسرے سے): ''دیکھئے! میں کئی بار آپ سے شکایت کر چکا ہوں کہ آپ کا بیٹا میری نقل اتارتا ہے، آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں؟''
دوسرے صاحب: ''اب نہیں کرے گا جناب! میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ بے وقوفوں جیسی حرکتیں مت کیا کرو۔''

☆

ایک صاحب کو اپنا گدھا فروخت کرنا تھا، چناں چہ انہوں نے اپنے دوست کے نام خط لکھا: ''میرے دوست اگر تمہیں کبھی کسی گدھے کی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لینا۔'' (حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

میری زندگی کے مقاصد

حمزہ نازک، چاچڑاں شریف
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے والدین کا نام روشن کروں گا۔

علیشا رفیق، راولپنڈی
میں بڑی ہو کر عالمہ بنوں گی اور دین کی تبلیغ کروں گی۔

حسن نثار، ساہی وال
میں کرکٹر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

رانا ہنی، گوجرانوالہ
میں سیاست دان بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

فاطمہ اعتزاز، اٹک
میں ڈاکٹر بن کر مریضوں کا مفت علاج کروں گی۔

محمد طلحہ خان، لاہور
میں ایک باادب اور مہذب انسان بنوں گا۔

لائبہ کنول، پشاور
میں حافظہ بن کر دینِ اسلام کی خدمت کروں گی۔

طوبیٰ راشد، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گی۔

عبداللہ گجر، لاہور
میں آئی ٹی انجینئر بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

سنینہ طارق، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

خدیجہ عمران، لاہور
میں عالمہ بنوں گی اور دین اسلام کی خدمت کروں گی۔

صباحت احمد، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

میمونہ ذوالفقار، لاہور
میں آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت اور والدین کا نام روشن کروں گی۔

موسیٰ بن ارفع، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔

مریم گل، ڈی آئی خان
میں پائلٹ بن کر ملک کی حفاظت کروں گی۔

حریم ظاہر، لاہور
میں سائنس دان بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گی۔

صفا رشید، کراچی
میں بڑی ہو کر ایک نیک انسان بنوں گی۔

نمرہ ظہور، فیصل آباد
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گی۔

شانزے عزیز، تربیلہ
میں ہارٹ سرجن بنوں گی۔

کتابیں

اقوام کے حال سناتی ہیں کتابیں
کیسے تھے ماہ و سال بتاتی ہیں کتابیں
ہاتھوں میں تھما کر علم و ہنر کا علم
سویا ہوا نصیب جگاتی ہیں کتابیں
اخلاق و آداب کے اسباق پڑھا کر
انسان کو انسان بناتی ہیں کتابیں
قلب و نظر میں نور کی شمعوں کو جلا کر
بندے کو اپنے رب سے ملاتی ہیں کتابیں
انسان کو اللہ کے احکام سکھا کر
کامل مسلمان بناتی ہیں کتابیں
سرسید و اقبال کے افکار دکھا کر
اقوام کو پروان چڑھاتی ہیں کتابیں
محکوم کو حاکم پر بالا بنا کر
شاہ کو شہنشاہ بناتی ہیں کتابیں

(طس کلثوم، چکوال)

موسم ہے ابھی سخت گرمی کا

موسم ہے ابھی سخت گرمی کا
سویا ہے ابھی بخت سردی کا
دوپہر کو سورج خوب آب و تاب سے چمکے
گھروں میں ہیں اب تو آم سب کے
بیٹھ کر سائے میں کھاتے ہیں خربوزے
سخت گرمی سے اب لگتے ہیں گال سوجے
مزے مزے کے مشروب پیتے ہیں ہم سب
خوب مزے سے آم کھاتے ہیں ہم سب
سکولوں سے لمبی چھٹیاں ملتی ہیں حسان
یہ ہے گرمی کا ہم پر بڑا احسان

(خلیل حسان، اٹک)

وقت کی قدر کرو

پیارے بچو! جینا سیکھو — وقت پہ کھانا پینا سیکھو
وقت کی قدر کبھی نہ کھونا — جلدی اٹھنا، جلدی سونا
خوب کرو تم سیر سپاٹا — جس دن ہو اسکول سے چھٹی
آج اصولوں کی پابندی — کل بخشے تمہیں...... بلندی
سب کو یہ سمجھانا بچو! — غافل نہ ہو جانا بچو!

(فائزہ مریم، منیزہ مریم، نوشہرہ، خوشاب)

علم کی فضیلت

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ مسجد میں تشریف لائے۔ وہاں دو مجلسیں ہو رہی تھیں۔ ایک حلقہ ذکر تھا اور دوسرا حلقہ علم۔ آپ ﷺ نے دونوں کی تعریف کی اور پھر علم کی مجلس میں شریک ہو گئے اور فرمایا کہ یہ پہلی مجلس سے بہتر ہے۔ (عدن سجاد، جھنگ صدر)

بیماری اور دولت

ایک دن بیماری نے دولت سے کہا: "تم بہت خوش نصیب ہو، ہر کوئی تمہیں پانے کی کوشش کرتا ہے۔"

دولت بولی: "خوش نصیب تو تم ہو جسے پا کر لوگ اپنے خدا کو یاد کرتے ہیں اور میں بدنصیب ہوں جسے پا کر لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں۔" (نبیہہ جمیل، لاہور)

عیادت کی برکت

جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جائے تو اسے چاہیے کہ صحت کے لیے دعا کرے، اسے صبر کی تلقین کرے اور اس سے ایسی باتیں کرے جن سے اس کا دل بہل جائے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا ہے:
''جب مسلمان صبح کے وقت اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور اگر وہ شام کے وقت عیادت کے لیے جاتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور اس کے لیے جنت کے پکے ہوئے پھل ہوتے ہیں۔
(دعا اعظم، شیخوپورہ)

سنہرے موتی

☆ دعا سے دُوری انسان کو دوا کے قریب لاتی ہے۔
☆ محبت دولت سے نہیں اچھے اخلاق اور بہتر رویے سے حاصل ہوتی ہے۔
☆ ایسی شناسائی جو فوراً ہو جائے پچھتاوے کا سبب بنتی ہے۔
☆ ضبط نہ ہو تو زندگی میں ربط باقی نہیں رہتا۔
☆ ہمیشہ سمجھوتا کرنا سیکھو، کیوں کہ تھوڑا سا جھک جانا کسی رشتے کا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جانے سے بہتر ہے۔ (اسماء نعیم، گجرات)

سنہری باتیں

☆ انسان بہت کچھ تقدیر پر جب کہ تقدیر بہت کچھ انسان پر چھوڑتی ہے۔
☆ ناکامی کے اسباب ہمیشہ آدمی کے اندر ہوتے ہیں مگر وہ انہیں دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔
☆ معاشرہ پر تمہارا اس سے بڑا احسان اور کوئی نہیں ہو گا کہ تم خود سنور جاؤ۔
☆ جو اللہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے، اللہ اس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔
☆ آدمی کا تنہا بیٹھنا بُرے ہم نشین کے ساتھ بیٹھنے سے بہتر ہے۔
(اریج عزیز الرحمن، گوجرانوالہ)

سخاوت

حاتم طائی کی بہن بھی بہت سخی تھی جو کچھ ہاتھ آتا، سب خرچ کر دیتی تھی کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ اس کے بھائیوں نے ایک مرتبہ اسے ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا اور کھانے پینے کو بھی نہیں دیا۔ ایک آدھ دن کے بعد اسے یہ سمجھ کر رہا کر دیا گیا کہ اب فقر اور بھوک کا اسے احساس ہو گیا ہو گا لہٰذا فضول خرچی نہیں کرے گی۔ اچھا ہونے کے بعد اس نے ایک سائلہ کو دیکھا اور اسے اپنا سارا مال دے دیا اور کہنے لگی: ''میں نے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کے بعد میں کسی کو مصیبت زدہ کے لیے ہاتھ روک نہیں سکتی۔''
(محمد ضیاء اللہ، شمائلہ ناز، میانوالی)

تعلیم

قائداعظم نے فرمایا: ''تعلیم پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ تعلیمی میدان میں مطلوبہ پیش رفت کے بغیر نہ صرف اقوام عالم سے پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا نام و نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔''

ماں

☆ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ (حدیث شریف)
☆ اگر ہم بہترین قوم کے خواہش مند ہیں تو ہمیں بہترین مائیں پیدا کرنی ہوں گی۔ (سر سید احمد خان)
☆ سخت سے سخت دل کو ماں کی پُرنم آنکھوں سے نرم کیا جا سکتا ہے۔ (علامہ اقبال)
☆ ہماری ماں نے ہمیں زندہ رہنے اور آزادی سے زندگی گزارنے کا سبق دیا ہے۔ (مولانا شوکت علی)
☆ ماں کی محبت حقیقت کا آئینہ ہوتی ہے۔ (مولانا الطاف حسین حالی)
☆ جس گھر میں تعلیم یافتہ اور نیک ماں ہو، وہ گھر تہذیب و انسانیت کی درس گاہ ہوتا ہے۔ (فریڈرک)
(عاقب الرحمٰن آرائیں، ٹانک)

انمول موتی

☆ بدصورت چہرہ بہتر ہے، بدصورت دل اور بدصورت دماغ سے۔
☆ جو کام خود کر سکتے ہو، اسے دوسروں پر مت چھوڑو۔
☆ سست آدمی کو کبھی فرصت نہیں ملتی۔
☆ غلط بات پر اڑے رہنا کم ظرفی ہے۔ (عظیم ڈوگر، ملتان)

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانہ ۔۔۔ وہ باغ کی بہاریں، وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی ۔۔۔ اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر، آتا ہے یاد جس دم ۔۔۔ شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت ۔۔۔ آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں

ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ۔۔۔ ساتھی تو ہیں وطن میں، مَیں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں ۔۔۔ میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں

ڈر ہے یہیں قفس میں، مَیں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے ۔۔۔ دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے ۔۔۔ دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھکو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی، تُو چھوڑ کر دُعا لے

(علامہ اقبالؒ)

نشانِ حیدر

نشانِ حیدر پاکستان کا سب سے اعلیٰ فوجی اعزاز ہے جو میڈل کی صورت میں صدرِ پاکستان پہناتے ہیں۔ یہ غیر معمولی بہادری

کے صلے میں ملتا ہے۔ نشانِ حیدر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت کو سامنے رکھ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے "Mark Of The Lion" یہ اعزاز سب سے پہلے کیپٹن محمد سرور شہید کو 16 مارچ 1957ء میں دیا گیا۔ بعدازاں ستمبر 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں کئی شہداء نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ آخری بار یہ اعزاز حوالدار لالک جان کو کارگل کی جنگ میں 15 جولائی 1999ء کو دیا گیا۔ یہ دشمن سے پکڑے گئے اسلحہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں 88 فی صد کاپر (Copper)، 10 فی صد ٹن (Tin) اور 2 فی صد جست (Zinc) ہوتا ہے۔ اب تک صرف 10 بہادر جوان یہ اعزاز حاصل کر سکے ہیں۔ یہ میڈل اب تک شہداء حاصل کر سکے ہیں۔ آج تک کسی غازی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

جونک

جونک (Leech) کا سائنسی نام "HIRUDO MEDICINALIS" ہے۔ اس کا تعلق جانوروں کے گروہ فائیلم "ANNELIDA" سے ہے۔ یہ بیرونی طفیلیے (Parasites) ہے جو انسانوں سمیت جانوروں کا خون پی لیتی ہے۔ اس کی 700 انواع ہیں۔ اس کی 5 سے 8 تک آنکھیں ہوتی ہیں۔ 100 اقسام سمندر، 90 اقسام خشکی اور باقی تازہ پانی کی اقسام ہیں۔ ان کے جسم پر دھاریاں (Segments) ہوتے ہیں۔ ان میں 32

دماغ ہوتے ہیں جو ہر Segment میں پائے جاتے ہیں۔ یہ "HIRUDIN" خامرہ پیدا کرتی ہیں جو خون کو جمنے نہیں دیتا۔ تقریباً 2500 سال سے انسان انہیں طبی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ انہیں زخموں سے باندھ دیتے ہیں جہاں سے یہ پیپ اور خون پی لیتی ہیں۔ کمپیوٹر کی دُنیا میں ایسے پروگرام کو "Leech" کہتے ہیں جن سے لوگ بغیر قیمت فائدہ اٹھا لیں۔ مثلاً WIFI

CLARE MONT اور ROMITA نے "Leech" کے کردار سے "MARVEL COMICS UNIVERSE" بھی لکھی ہے۔

ATM مشین

بینک میں کسی کیشیئر سے رقم لینے کی بجائے مشین سے اپنی مطلوبہ رقوم نکلوانے کے لیے ATM مشین استعمال ہوتی ہے جسے "AUTOMATED TELLER MACHINE" یا ABM "AUTOMATED BANKING MACHINE" کہا جاتا ہے۔ یہ

بینک سے متصل علیحدہ کمرے میں نصب ہوتی ہے۔ بینک میں داخل ہوئے بغیر مخصوص کارڈ جو صارف کو بینک جاری کرتا ہے، مشین میں ڈال کر مطلوبہ رقم نکلوا لیتا ہے۔ لہٰذا یہ خودکار نقد شماری آلہ یا نقدی آلہ کہلاتا ہے۔ جاپان، برطانیہ، سری لنکا، سویڈن اور امریکہ نے اس نقدی آلے کا استعمال شروع کیا۔ یہ مشین سب سے پہلے امریکہ میں 1960ء کی دہائی میں متعارف کروائی گئی۔ ATM مشین کے کئی حصے ہوتے ہیں جن میں CPU، چپ کارڈ، پن پیڈ، کیلکو لیٹر، فنکشنل Keys خاص طور سے نمایاں ہیں۔

پاکستان میں 1990ء کی دہائی میں حبیب بینک لمیٹڈ نے پہلی بار ATM مشین کے استعمال کا آغاز کیا۔

لاہور میوزیم

لاہور میوزیم (Lahore Museum) 1894ء میں تعمیر کیا گیا جو کہ جنوبی ایشیاء کے چند اہم ترین تاریخی مراکز میں سے ایک ہے۔ لاہور میوزیم کو مرکزی میوزیم بھی کہا جاتا ہے اور یہ لاہور کی معروف شاہراہ مال روڈ پر واقع ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ کے والد جان لاک ووڈ کپلنگ اس موزیم کے بڑے مداح تھے اور ان کا ناول ''کم'' لاہور میوزیم کے گرد گھومتا ہے۔ 2005ء میں اس میوزیم میں تشریف لانے والے سیاحوں کی تعداد تقریباً 250,000 سے زیادہ تھی۔ یہ میوزیم یونیورسٹی ہال کی قدیم عمارت کے بالمقابل واقع مغلیہ طرزِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اس میوزیم میں لکڑی کے

کام، مصوری کے فن پارے اور دوسرے نوادرات بھی موجود ہیں جو مغل، سکھ اور برطانوی دورِ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میوزیم میں چند آلاتِ موسیقی کے علاوہ قدیم زیورات، کپڑا، برتن اور جنگ و جدل کا ساز و سامان شامل ہے۔ یہاں قدیم ریاستوں کی یادگاریں بھی ہیں جو کہ سندھ طاس تہذیب کی یاد دلاتی ہیں۔ اس میں بدھا دور کی یادگاریں بھی ہیں۔ بدھا کا ایک مجسمہ جس کو نروان بدھا کا نام دیا جاتا ہے جو اس میوزیم کی سب سے مشہور یادگار تصور کی جاتی ہے۔ 2004ء میں نوبوا کی تانا کا جو پاکستان میں جاپانی سفیر تھے، انہوں نے پہلی بار جاپان کی جامعات کو یہاں اس مجسمے پر تحقیق کے لیے دعوت دی۔ حکومت پاکستان اور جامعات کے شعبۂ تاریخ کو اس بارے مزید تحقیق سے شناسائی ہوئی کیوں کہ بدھا جاپان میں انتہائی قابل احترام تصور ہوتے ہیں اور محققین کا کام قابل ستائش ہے۔ ☆☆☆

ہم نے سوچتے سوچتے وقت گنوا دیا رومیؔ
وہ جو اہلِ قلم تھے عنوانِ زندگی لکھ گئے
(عبدالجبار رومیؔ، لاہور)

ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
ایک مرکز پہ بلانے کے لیے آپؐ آئے
(اُم حبیبہ، دینہ)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
(افزاح اکبر، لاہور)

پھیلے ہوئے ہاتھوں کو حقارت سے نہ دیکھو
ہر شخص کی چوکھٹ پہ گداگر نہیں ہوتے
(محمد عبداللہ ثاقب، پشاور)

ہنسی آتی ہے مجھے حضرتِ انسان پر
گناہ کرتا ہے خود لعنت بھیجتا ہے شیطان پر
(عدن سجاد، جھنگ صدر)

اتنے سراب دیکھے ہیں آنکھوں نے عمر بھر
دریا بھی نگاہوں میں اب دریا نہیں رہا
(محمد حمزہ سعید، بورے والا)

زباں پر مومنوں کے جب ذکر تاجدار آئے
تو اس کے بعد لازم ہے کہ ذکرِ حق چار یار آئے
ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ باغباں جب ہوں
تو پھر کیوں نہ باغِ مصطفیٰ میں بہار آئے
(عبداللہ شاہ، دریا خان)

یہ جو پُر شکستہ ہے فاختہ
یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستان میرے عہد کی
جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے

جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی
جہاں حکمرانی ہو لوٹ کی
جہاں بات کرنی محال ہو
وہاں آگہی بھی عذاب ہے
(فائقہ عابد، حافظ حذیفہ عابد، قصور)

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سردارا
(علامہ اقبالؒ)

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے

☆

رخِ مصطفیٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کی بزمِ خیال میں نہ دُکانِ آئینہ ساز میں
(جویریہ یونس، لاہور)

میری بیاض میں وہ واقعات ملتے ہیں
میری نظر نے دیکھے یا مجھ پہ بیتے ہیں
(محمد شارق، نوشہرہ)

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

☆

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا
(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
(معروشہ عزیز، لاہور)

یہ منہ اور مسور کی دال

کہتے ہیں کسی رئیس کو باورچی کی ضرورت تھی۔ ایک باورچی آیا جسے انٹرویو کے لیے رئیس کے سامنے پیش کیا گیا۔ رئیس نے پوچھا: ''کیا کیا پکا سکتے ہو؟''

''حضور! کیا کیا گنواؤں، سب کچھ اور بہت کچھ پکا سکتا ہوں۔ حکم کریں تو کچھ پکا کر پیش کروں۔'' باورچی بولا۔

''ہاں! تمہارا امتحان لے کر ہی تمہیں رکھیں گے، کیا پکاؤ گے؟'' رئیس خوش ہو کر بولا۔

''حضور! پلاؤ، دم پخت، روغنِ جوش، قورمہ جیسے کھانے تو ہر باورچی پکا لیتا ہے، مگر ہنرمند باورچی وہ جو دال ایسی پکائے کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔ آج میں آپ کو مسور کی دال پکا کر کھلاؤں گا۔'' باورچی نے بڑے فخر سے سینہ تان کر کہا۔

''بہت خوب! چلو آج مسور کی دال ہی سہی۔'' رئیس نے خوش ہو کر کہا اور منشی کو حکم دیا کہ جو چیزیں باورچی کو درکار ہوں، وہ مہیا کر دی جائیں۔ باورچی خانے میں جا کر باورچی نے منشی سے ضرورت کی چیزیں لکھوائیں تو ان میں ایسے ایسے قیمتی مصالحے اور زعفران وغیرہ شامل تھے جن کی لاگت کم از کم دو سو روپے بنتی تھی۔ منشی پریشان ہو کر رئیس کے پاس آیا اور فہرست دکھائی جسے دیکھ کر رئیس نے کہا: ''ارے بھائی! تم محض مسور کی دال پر اتنا خرچہ بتا رہے ہو تو اچھے کھانوں پر کتنا خرچہ اٹھاؤ گے؟ نہ بھئی، ہم باز آئے ایسی دال سے، تم جا سکتے ہو۔''

رئیس کے اس رویے پر باورچی کو بڑا غصہ آیا اور وہ بھڑک کر بولا:

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، جاتا ہوں مگر یہ سن لو کہ ایسی دال کھانے والوں کی شکلیں بھی اور ہوتی ہیں..... اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔''

اس نے رئیس کی طرف اشارہ کیا اور چلتا بنا۔ ایسی صورت حال میں کہ جب کوئی شخص کسی چیز کا اہل نہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔

صدیوں پہلے سوریہ پر ایک نیک دل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ سوریہ شام اور یمن کے قریب ایک علاقے کا نام ہے۔ اس بادشاہ کے دورِ حکومت میں لوگ خوش حالی اور بے فکری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ انتہائی رحم دل، قدرشناس اور خدا ترس تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے شاعر، ادیب، نجومی، پہلوان، تلوار باز اور گلوکار اکٹھے کیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بادشاہ کے حضور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور انعامات پاتے، غرض ہر طرف چین ہی چین اور سکھ ہی سکھ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ شاہی طبیب کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک بوڑھا ماہر حکیم تھا اور اس کے ہاتھ میں بہت شفا تھی۔ فوراً ہی نئے طبیب کی تلاش شروع ہوئی تاکہ اس آسامی کو پُر کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں بہت سے حکیموں کے انٹرویو ہوئے۔ بادشاہ خود بھی علمِ طب سے واقف تھا۔ وہ امیدواروں سے مشکل مشکل سوالات پوچھتا لیکن کسی کے جواب سے مطمئن نہ ہوتا۔ آخر خدا خدا کر کے بادشاہ کو ایک طبیب پسند آ گیا جس کا نام حکیم حارث تھا۔ حکیم حارث نے بادشاہ کے پیچیدہ سوالوں کا تفصیل سے جواب دیا اور یوں اگلے ہی دن وہ شاہی طبیب مقرر ہوگیا۔ بادشاہ نے اس کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک دل چسپ واقعہ ہوا۔ بادشاہ کے سر میں شدید درد ہوا، زکام بھی ہوگیا اور بار بار کھانسی اٹھنے لگی۔ بادشاہ نے حکیم حارث کو بلا کر نبض دیکھنے کا حکم دیا۔

''بادشاہ سلامت! فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ کو موسم کی تبدیلی کے باعث معمولی تکالیف ہیں اور ان کا علاج آپ کے باغ میں ہی موجود ہے۔'' حکیم حارث نے معائنے کے بعد کہا۔

''میں جانتا ہوں یہ موسمی تکالیف ہیں'' بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن میرے باغ میں ان کا علاج ہونے کا کیا مطلب ہے؟

''عالی جاہ! میں آج ہی آپ کو ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ ذرا انتظار کیجیے۔'' یہ کہہ کر حکیم حارث شاہی باغ میں گیا اور مختلف رنگوں کے پھول توڑ لایا۔ اس نے ان پھولوں کو اُبال کر جوشاندہ تیار کیا اور شہد گھول کر بادشاہ کو گرم گرم پلایا۔

جوشاندہ بہت خوش رنگ اور خوش ذائقہ تھا۔ صبح جب بادشاہ سو کر اُٹھا تو سارا مرض غائب ہو چکا تھا۔ وہ دل سے حکیم حارث کی قابلیت کا قائل ہوگیا۔ اس نے بھرے دربار میں اس کی تعریف کی اور انعام بھی دیا۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ حکیم حارث بادشاہ کے قریب ہوتا رہا حتیٰ کہ چند سال میں اس کا وظیفہ بھی کئی گنا بڑھ گیا۔ ایک مرتبہ

بادشاہ دربار لگائے بیٹھا تھا۔ اسے اطلاع دی گئی کہ ایک نوجوان حاضری کی اجازت چاہتا ہے۔ اس نے اجازت دے دی۔ آنے والا حکیم حارث ہی کی عمر کا جوان تھا۔ قد کاٹھ بھی ویسا ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ قدیم طبی کتابوں کا بڑا ماہر ہے اور اس نے بوڑھے حکیموں سے بڑی محنت سے یہ فن سیکھا ہے، لہٰذا اسے بھی اس کی قابلیت کی بنا پر شاہی حکیم مقرر کیا جائے۔ بادشاہ نے پہلے تو اسے تعجب سے دیکھا پھر اپنی عادت کے مطابق اس سے سوالات پوچھے۔ اس نے بھی عمدہ جوابات دیئے بادشاہ نے خوش ہو کر اسے بھی شاہی عملے میں شامل کر دیا۔ اب دربار میں دو طبیب ہو گئے، ایک حکیم حارث اور دوسرا حکیم بکر یعنی یہ نیا آنے والا نوجوان۔

تھوڑا عرصہ تو چین سے گزرا پھر دونوں حکیموں کی آپس میں چپقلش ہونے لگی۔ دونوں ہر معاملے میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے۔ شاہی خاندان کا کوئی فرد بیمار ہو جاتا تو حکیم حارث کہتا کہ اس کا فلاں علاج مفید رہے گا۔ حکیم بکر کہتا کہ نہیں جی، فلاں دوا سے شفا ہوگی۔ غرض دونوں ایک دوسرے کی تردید کرتے اور لڑتے جھگڑتے۔

انہی دنوں دونوں شہزادے بیمار ہو گئے۔ بادشاہ کے دو ہی بیٹے تھے اور وہ انہیں بہت پیار کرتا تھا۔ دونوں کے جسم پر چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے دونوں طبیبوں سے مشورہ کیا۔

''بادشاہ سلامت!'' حکیم حارث کہنے لگا۔ ''دراصل شہزادوں کو خسرہ نکل آیا ہے اور اس بیماری میں شربت عناب بہت فائدہ مند ہے۔ میں دونوں کو یہی پلاؤں گا، تین دن میں شفا ہو جائے گی۔''

حکیم بکر نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ حارث کی بات بڑی توجہ سے سن رہا ہے تو بولا۔ ''بڑے حکیم صاحب سے تشخیص درست نہیں ہوئی۔ بادشاہ سلامت! بات دراصل یہ ہے کہ ان بچوں کے خون میں فاسد مادے پیدا ہو گئے ہیں جو جلد پر دانوں کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایسے میں شربت عناب ہرگز نہیں دینا چاہیے البتہ عرقِ مصفی سے فوراً فائدہ ہوگا۔''

حکیم حارث نے جب یہ بات سنی تو غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ وہ بکر کو سرے سے طبیب ہی نہ سمجھتا تھا۔ چناں چہ اس نے پُرزور الفاظ میں کہا کہ اگر شربت عناب نہ دیا گیا تو شفا نہ ہوگی۔ حکیم بکر بھی کچھ کم نہ تھا، اس نے بھی دعویٰ کیا کہ بغیر عرقِ مصفی کے صحت نہ ہوگی۔

ان دونوں کی بحث جب بہت زیادہ بڑھی تو بادشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک شہزادے کا علاج حکیم حارث کرے اور دوسرے کا حکیم بکر، جو طبیب علاج میں ناکام ہوا اسے شاہی نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا۔ دونوں طبیبوں کے پاس اپنی قابلیت دکھانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی تشخیص کے مطابق اپنے اپنے مریض کو علیحدہ علیحدہ دوا استعمال کروائی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تیسرے دن سے شہزادوں کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی اور ایک ہفتے میں دونوں بھلے چنگے ہو گئے۔

بادشاہ نے دونوں کو انعام دیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ اب ان کا فیصلہ کیسے کیا جائے؟ دوسری طرف حارث اور بکر میں بھی ٹھن گئی۔ حکیم حارث اپنے کو زیادہ قابل سمجھتا تھا اور بکر کو اپنے مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا جب کہ حکیم بکر کا خیال تھا کہ صحیح مہارت اس میں ہے اور حارث دوسرے نمبر پر ہے۔ غرض دونوں اسی طرح لڑتے جھگڑتے رہے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں قدرت کی طرف سے اس مسئلے کا حل خود ہی نکل آیا۔ روز روز کی بک بک سے تنگ آ کر ایک دن حارث نے بکر کو چیلنج کر دیا کہ وہ زہروں کا علم جانتا ہے اور اس کے پاس ایک ایسے زہر کا نسخہ ہے کہ اگر کسی کو پلا دیا جائے تو تین منٹ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔

''میں بھی زہروں کا علم جانتا ہوں۔'' بکر نے تڑاک سے جواب دیا۔ ''اور میرے پاس ایسا نسخہ ہے کہ ہر زہر کو بے کار کر دیتا ہے۔ میں تم سے زیادہ قابل ہوں۔ حارث! میرے پاس ایک ایسا منتر ہے کہ اگر وہ کسی پر دم کر دیا جائے تو تین منٹ کیا تین لمحوں میں بے دم ہو کر مر جاتا ہے۔ ہمت ہے تو تم بھی میرا چیلنج قبول کرو۔''

چناں چہ اس بات کو قبول کر لیا گیا کہ دونوں حکیم ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں۔ بادشاہ تو پہلے ہی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح ان دونوں کا فیصلہ ہو۔ اس نے اگلے مہینے کی یہی تاریخ مقابلے کے لیے مقرر کر دی۔

دن گزرتے گئے، مقررہ تاریخ بھی آ گئی۔ دربار لگ گیا اور دونوں حکیم ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

پہلے حکیم حارث نے اپنے تھیلے سے شیشے کی ایک بوتل نکالی۔ اس میں گہرے سیاہ رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ اس کے چہرے

پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے بوتل والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور اونچی آواز میں بولا۔

''بکر! بچے یہ وہ نسخہ ہے جس کے لیے میرے استاد نے مجھ سے دس برس خدمت لی تھی۔ یہ ایسا زہر ہے جو معدے، جگر، آنتوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے ذرا اسے پی کر تو دکھاؤ'' یہ کہہ کر اس نے بوتل والے ہاتھ کو ذرا سا ہلایا۔

حکیم بکر تھوڑی دیر بوتل کو دیکھتا رہا، پھر خود اعتمادی سے آگے بڑھا۔ اس نے حارث کے ہاتھ سے بوتل لی اور آنکھوں کے قریب کر کے اسے دیکھا۔ پھر اچانک اس نے بوتل ہونٹوں سے لگا لی اور سارا زہر غٹا غٹ پی گیا۔

زہر پیتے ہی اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پلٹ کر گرا۔ حارث یہ دیکھ کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بکر زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں الٹتی جا رہی تھیں اور وہ جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے گلے سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنا شروع ہوئیں اور اس نے ہاتھ پاؤں زمین پر مارنے شروع کیے۔ ساتھ ہی اسے خون کی قے آ گئی جس سے اس کے کپڑے آلودہ ہو گئے۔

سارا دربار سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک منٹ کے بعد بکر نے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور جیب میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس شیشی میں کوئی سفید رنگ کی دوا بھری ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے ڈھکن ہٹایا اور شیشی منہ سے لگا لی۔ دوا کا حلق میں اُترنا تھا کہ اس کے جسم کو دوبارہ جھٹکا لگا اور ہاتھ پاؤں کی پھڑکن رک گئی۔ تھوڑی دیر میں اعضاء کی کپکپاہٹ بند ہوگئی اور سانس آنے لگا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو سمیٹا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سب نے دیکھ لیا کہ بکر نے حارث کے زہر کا توڑ کر لیا۔ اس دوران حارث کی نظر اس چھوٹی سی شیشی پر تھی جو ایک طرف پڑی تھی۔ اس میں کوئی ایسی دوا بھری ہوئی تھی جس نے اس کے زہر کو بے کار کر دیا تھا۔ بکر نے آگے بڑھ کر شیشی اُٹھائی اور اسے واپس جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''دوست! یہ وہ نسخہ ہے جس کے لیے میرے استاد نے مجھ سے دس برس خدمت لی تھی۔ یہ ہر قسم کے زہر کا اثر ختم کر دیتا ہے آخر میں بھی تو استادوں کا سکھایا ہوا ہوں۔''

حارث نے یہ سن کر اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

اب اصول کے مطابق بکر کی باری تھی۔ اس نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے اسے اجازت دی کہ اب وہ خود کو قابل ثابت کرے۔ چناں چہ پہلے وہ مسکرا مسکرا کر تھوڑی دیر حارث کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''بڑے حکیم صاحب! ذرا یہیں ٹھہریں، میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دربار سے نکل گیا۔ ہال میں مکمل سناٹا تھا۔ بادشاہ اور درباری خاموش تھے اور حارث بُت بنا کھڑا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بکر اب کیا کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد بکر واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگوں کے پھول تھے۔ وہ حارث کے قریب آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو کر کچھ پڑھا اور پھولوں پر دم کیا، پھر دوبارہ کچھ پڑھا اور دم کیا اور پھر تیسری دفعہ بھی یہی عمل کیا۔

اس دوران حارث کا چہرہ پھیکا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی پھول تھے جن سے پہلی مرتبہ حارث نے بادشاہ کا علاج کیا تھا۔ آج انہی پر منتر دم کر کے حارث کی قبر کا سامان کیا جا رہا تھا۔ دم کرنے کے بعد بکر نے پھول حارث کی طرف بڑھائے اور کہا۔

''حارث پیارے! تمہارا دُنیا سے جانے کا وقت آ گیا ہے، مجھ سے مقابلہ نہ کرتے تو کچھ دن اور جی لیتے۔ اچھا! تمہاری مرضی یونہی ہے تو یونہی سہی۔ لو یہ پھول سونگھ لو، تمہارا کام ہو جائے گا۔ الوداع میرے دوست!''

دوسری طرف حارث کا رنگ سفید ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ دیوانوں کی طرح پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ بکر نے اسے بتایا تھا کہ ان پھولوں پر ایسا منتر دم ہے جس سے آدمی تین لمحوں میں مر جاتا ہے۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے پھول پکڑے اور ڈرتے ڈرتے انہیں ناک کے قریب لایا۔ پھول سونگھتے ہی وہ چکرا کر گرا اور پھڑک کر وہیں ختم ہو گیا۔ فیصلہ ہو چکا تھا اور بکر جیت چکا تھا۔ سارے دربار نے بکر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اسی دن سے بکر کو شاہی طبیب مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح بکر بادشاہ کا منظورِ نظر بن گیا۔

کافی عرصہ بعد بکر نے بادشاہ کو راز بتایا کہ اس نے صرف دکھاوا کیا تھا۔ وہ کوئی منتر جانتا ہے اور نہ ہی اس نے پھولوں پر کچھ دم کیا تھا۔ یہ صرف خوف کا اثر تھا جس نے حارث کی جان لے لی۔

☆☆

انناس اور ناریل ٹرائفل

سامان اور وزن:

انناس: ایک ٹن کے ٹکڑے 500 گرام چینی: 100 گرام ناریل کا دودھ: 100 ملی لیٹر لونگ: 2 عدد

فروٹ کیک: ایک چھوٹا 150 گرام آئسنگ شوگر: 2 کھانے کے چمچ دارچینی: ایک انچ کا ٹکڑا کریم: 150 ملی لیٹر

انناس: 7،6 عدد گول ٹکڑے بادیان کا پھول: 1/4 عدد ڈبے کا دہی: 4 کھانے کے چمچ خشک کھوپرا کُترا ہوا: 2 کھانے کے چمچ

ترکیب: انناس ٹن سے نکالیں اور اس کے رس کو ایک پتیلی میں ڈالیں۔ لونگ، دارچینی، بادیان اور چینی ڈال کر ابالیں۔ جب ایک پیالی رہ جائے تو چولہے سے اتار کر چھان لیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ کیک کو چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور ڈش کے پیندے میں سجا لیں۔ 4، 5 انناس کی سلائس چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر، تین چوتھائی رس کے ساتھ کیک کے اوپر پھیلا دیں۔ کریم کو اتنا پھینٹیں کہ خوب پھول جائے۔ چینی، دہی اور ناریل کا دودھ کریم میں ملا لیں۔ بچا ہوا رس، 7،6 انناس کے ٹکڑے اور آئسنگ شوگر کو بلینڈر میں پیس لیں اور 2 کھانے کے چمچ کھوپرے کے ساتھ کریم میں ملا دیں۔ اس آمیزے کو کیک اور انناس کے ٹکڑوں کے اوپر ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ 2 کھانے کے چمچ خشک کھوپرا توے پر بھون کر ٹرائفل کے اوپر چھڑک دیں۔ انناس کے گول ٹکڑے اور چیری سے سجا کر پیش کریں۔

فیسٹو رائس پڈنگ

سامان اور وزن:

باسمتی چاول: 100 گرام چینی: 100 گرام کنڈینسڈ مِلک بغیر چینی کے: 400 ملی لیٹر ونیلا ایسنس: 1/2 چائے کا چمچ

انڈے: 4 عدد پھینٹی ہوئی زردی دودھ: 1/2 لیٹر کریم: 400 ملی لیٹر جلیٹن: 8 چائے کے چمچ

ترکیب: ایک گھنٹے کے لیے چاول بھگو کر دھو لیں۔ صاف چاول ایک لیٹر پانی کے ساتھ اُبالیں۔ پھر ہلکی آنچ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ کنڈینسڈ مِلک شامل کریں اور 20 منٹ مزید پکائیں۔ اب چینی ملائیں، گھل جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ 400 ملی لیٹر گرم دودھ میں جیلیٹن گھول لیں۔ بقیہ دودھ گرم کریں، چینی، وینیلا ایسنس اور جیلیٹن والا دودھ اس میں ملا لیں۔ انڈے کی زردی کو تھوڑا تھوڑا کر کے گرم دودھ میں ملائیں، اُبلنے سے پہلے چولہے سے اُتار لیں۔ اس دودھ کو چاول میں ملا لیں۔ کریم خوب پھینٹ کر پڈنگ میں ملا لیں اور تیار سانچے میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ جم جائے تو پلاسٹک شیٹ کی مدد سے پڈنگ سانچے سے نکال کر پلیٹ میں اُلٹ کر رکھ دیں۔ پلاسٹک ہٹا کر پستہ سے سجا دیں۔

لبنیٰ کی امی جان محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں اور ان کے پڑھانے کا طریقہ کچھ ایسا اچھا تھا کہ کند ذہن سے کند ذہن لڑکی بھی چند دنوں میں فرفر سبق سنانے لگتی تھی۔

اس کے علاوہ ان کی اور باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ اپنے گھر کو ایسا صاف ستھرا رکھتی تھیں کہ چاول بکھیر کر چن لو۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتیں تو آگے بڑھ کر اس کی مدد کرتیں، یہاں تک کہ جانوروں تک کو بھی ان کی نیک دلی سے فائدہ پہنچتا تھا۔

ایک بار ایک بلی لنگڑاتی ہوئی ان کے گھر آئی۔ کسی غصے والی خاتون نے بے چاری کی ٹانگ پر گرم چمٹا مار دیا تھا۔ لبنیٰ کی امی نے اسے زخمی دیکھا تو بڑے پیار سے اس کی ٹانگ پر دوا لگائی اور جب تک وہ اچھی نہ ہوگئی، دودھ روٹی کھلاتی رہیں اور یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ بس ایک دفعہ ہوگئی ہو۔ انہوں نے نہ جانے کتنی بلیوں کی اسی طرح خدمت کی تھی۔

ان اچھی خاتون کی ایک بہت ہی پیاری عادت یہ تھی کہ صبح کے وقت روٹیاں پکانے کے لیے آٹا گوندھتی تھیں تو تھوڑا سا گیلا آٹا چڑیوں کو ضرور ڈالتی تھیں۔ ڈھیروں چڑیاں ان کے صحن میں آ جاتیں اور چوں چوں کے گیت گاتے ہوئے آٹا کھاتی رہتیں۔ یہ تماشا خاصا دل چسپ ہوتا تھا۔ چوں چوں چڑ چوں کرنے کے ساتھ ننھی منی چڑیاں آپس میں لڑتی جھگڑتی بھی تھیں۔ ایک آٹے کی گولی چونچ میں اُٹھاتی تو دوسری اس سے چھیننے کی کوشش کرتی۔ کبھی تیسری بھی اس چھینا جھپٹی میں شامل ہو جاتی اور لبنیٰ کے گھر کا چھوٹا سا صحن چڑیوں کا میدانِ جنگ بن جاتا۔

لبنیٰ اور اس کے بھائی سلیم کو چڑیوں کا یہ لڑائی جھگڑا بہت اچھا لگتا تھا۔ ان کی امی جان آٹا گوندھنے بیٹھتیں تو وہ دونوں برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ جاتے اور یہ دل چسپ تماشا دیکھتے رہتے۔

چڑیوں کی بے وجہ کی اس لڑائی میں دو چڑے بہت کامیاب رہتے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے دوسری چڑیوں کو ہرا دیتے تھے۔ دو چار چونچیں اور پنجے مار کر ہی ان سے آٹا چھین لیتے اور ہڑپ کر جاتے۔

جیسا کہ ہم نے بتایا، لبنیٰ کے گھر میں یہ تماشا روز ہی ہوتا تھا، اور لبنیٰ اور سلیم بہت شوق سے اسے دیکھتے تھے۔ انہیں یہ چڑے اس وجہ سے بہت اچھے لگتے تھے کہ یہ لڑنے جھگڑنے کا تماشا زیادہ دکھاتے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کے نام رکھ لیے تھے اور آپس

میں انہیں بانٹ بھی لیا تھا۔ لبنیٰ نے اپنے چڑے کا نام شیر رکھا تھا اور سلیم نے اپنے چڑے کا دلیر۔

دوسری چڑیوں سے لڑنے اور ان کی چونچوں سے آٹا چھین کر کھا جانے کے علاوہ شیر اور دلیر آپس میں لڑ پڑتے تھے اور اس دن لبنیٰ کے صحن میں بڑا دنگل ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر لبنیٰ کہتی: ''دیکھ لینا، میرا شیر جیتے گا!''

سلیم کہتا: ''اونہوں! میرا دلیر تمہارے شیر کو ہرا دے گا!''

اور ہوتا یہ کہ کبھی شیر دلیر کی چونچ سے آٹا چھین کر اڑ جاتا اور کبھی دلیر فتح حاصل کرتا۔

چڑیوں کے لڑنے جھگڑنے کے بارے میں لبنیٰ کی امی خوب جانتی تھیں لیکن انہیں اس لڑائی جھگڑے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اُدھر لبنیٰ اور سلیم کا یہ حال تھا کہ گویا دُنیا کا سب سے خاص کام شیر اور دلیر کی ہار جیت کا فیصلہ کرنا ہی ہے۔ لبنیٰ نے تو اپنے شیر کی شان میں مزے دار شعر بھی کہے تھے۔ جیسے ہی شیر نظر آتا اور سلیم بھی وہاں ہوتا تو وہ گن گنانے لگتی ؎

میرے شیر کی اُونچی شان
میرا شیر گنوں کی کان
میرا شیر ہے سچ مچ شیر
گیدڑ ہے بھائی کا دلیر

سلیم نے بھی اپنے چڑے کی شان میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ کام یاب نہ ہوا تھا۔ وہ سادہ لفظوں ہی میں اپنے دلیر کی تعریفیں کرنے لگتا۔ وہ کہتا: ''لبنیٰ بی بی، تم کچھ بھی کہو، زیادہ شان تو میرے دلیر ہی کی ہے۔ آخری مقابلے میں میرا دلیر تمہارے شیر کو ایسی پٹخنی دے گا کہ تم اپنا سا منہ لے کے رہ جاؤ گی۔''

لبنیٰ کہتی: ''اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا کیا فائدہ۔ فیصلہ تو لڑائی کے میدان میں ہو گا اور یہ بات ساری دُنیا مانتی ہے کہ شیر سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہوتا۔''

ایک دن یہ بہن بھائی اسی طرح باتیں کر رہے تھے کہ ان کی امی جان وہاں آ گئیں۔ انہوں نے بچوں کی باتیں سنیں تو بولیں: ''اچھائی اور بڑائی کا فیصلہ لڑائی جھگڑوں سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اچھی باتیں کرنے کی طاقت کس میں زیادہ ہے۔ دُنیا کے سب عقل مند یہ بات مانتے ہیں کہ اصل طاقت سچائی اور نیکی ہے۔''

''لیکن امی جان ان چڑیوں کو کیا معلوم کہ سچائی کیا ہے اور نیکی کسے کہتے ہیں؟'' لبنیٰ نے کہا۔

''ہاں بیٹی، یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ یہ سب باتیں تو ہم انسانوں کو معلوم ہونی چاہئیں۔ یہ تو بھولے بھالے پنچھی ہیں۔ ان کی زندگی تو بس اتنی سی ہے کہ دانے دنکے کی تلاش میں اُڑتے پھریں اور رات ہو جائے تو اپنے گھونسلوں میں دبک کر سو جائیں۔ اسی لیے ان سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کون سا کام کیا اور کون سا کام نہیں کیا۔ ہاں، ہم انسانوں سے یہ حساب ضرور لیا جائے گا کہ ہم اس دُنیا میں جو زندگی گزار رہے ہیں، وہ کیسی تھی۔ یعنی ہم نے بھلائی اور نیکی کے کام زیادہ کیے یا برائی اور گناہوں کے کام۔ اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ بُرائیوں سے بچے اور اچھے کام کرتا رہے۔''

لبنیٰ کی امی کچھ اور کہنا چاہتی تھیں، لیکن سلیم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ''امی جان، یہ ساری باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ہم تو دراصل ان چڑوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جن میں سے ایک میرا اور دوسرا لبنیٰ کا ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں زیادہ طاقت ور کون ہے۔''

لبنیٰ جلدی سے بولی: ''امی جان، آپ کو معلوم ہے، میرے چڑے کا نام شیر اور سلیم بھائی کے چڑے کا نام دلیر ہے؟''

''ہاں! تم لوگوں کی زبانی یہ بات سنی تو کئی بار ہے لیکن بیٹی شیر یا دلیر نام رکھنے سے چڑے کی اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ رہتا تو وہ چڑا ہی ہے۔'' امی جان نے کہا۔

''لیکن یہ چڑے دوسرے چڑوں جیسے نہیں ہیں۔ جب ان کا آخری مقابلہ ہو گا تو آپ خود دیکھ لیں گی کہ یہ کتنے بہادر اور طاقت ور ہیں۔ اس جمعے کو ہم نے یہ مقابلہ رکھا ہے۔'' لبنیٰ بولی۔

امی جان نے بات ختم کرتے ہوئے کہا: ''اچھا بیٹی، ان کا مقابلہ بھی دیکھ لیں گے لیکن تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ چڑوں اور چڑیوں کا آپس میں لڑنا بہادری نہیں، نادانی ہے۔ بہادروں کی پہلی نشانی یہ ہوتی

ہے کہ وہ مل جل کر پیار محبت سے رہتے ہیں۔ سب عقل مند یہ بات مانتے ہیں کہ بہادری ایک اعلیٰ صفت ہے اور ہر اعلیٰ صفت میں عقل ضرور شامل ہوتی ہے جو اچھائی اور بُرائی کے بارے میں بتاتی ہے۔''

سلیم چپ چاپ بیٹھا اپنی امی اور بہن کی باتیں سن رہا تھا۔ امی نے عقل اور بہادری کے بارے میں بتایا تو جلدی سے بولا۔

''امی جان، یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ پاک نے عقل کا نُور دیا ہے تو دُنیا کے سب کام ٹھیک ٹھیک چل رہے ہیں۔ یہ نُور نہ ملتا تو ہر طرف تباہی پھیل جاتی۔ میری سمجھ میں یہ بات تو آ گئی ہے کہ یہ چڑیاں بے عقل ہیں۔ اسی لیے آپس میں لڑتی ہیں۔''

''اور میری سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی ہے کہ تم ہار جانے کے ڈر سے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ تمہارا دلیر میرے شیر سے ہار جائے گا۔'' لبنیٰ نے کہا۔

''لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اب مقابلہ نہیں ہوگا۔'' سلیم بولا۔ ''عقل کے نُور کی بات اپنی جگہ اور شیر اور دلیر کے مقابلے کی بات اپنی جگہ۔ دو دن بعد جمعہ ہے، معلوم ہو جائے گا کہ شیر ہارتا ہے یا دلیر۔''

جمعے کی صبح امی جان آٹا گوندھنے آئیں تو لبنیٰ اور سلیم برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر آ بیٹھے اور چڑیوں کا جھلڑ بھی چیں چیں، چوں کے گیت گاتا ہوا اُتر آیا۔ امی جان نے عادت کے مطابق گیلا آٹا ان کے آگے ڈال دیا۔ چڑیاں پنجے اور پَر پھیلا کر آٹے پر ٹوٹ پڑیں، اور جب صحن میں بکھری ہوئی گیلے آٹے کی گولیاں ختم ہونے لگیں تو آپس میں چھینا جھپٹی شروع کر دی۔

لبنیٰ اور سلیم سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب شیر اور دلیر دوسری چڑیوں اور چڑوں کو بھگا دیں گے اور پھر آپس میں لڑیں گے۔ روزانہ یوں ہی ہوتا تھا لیکن یہ دن اس لیے خاص تھا کہ ان کی آج لڑائی میں ان میں سے ایک کے زیادہ بہادر اور طاقت ور ہونے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ شیر اور دلیر نے دوسری چڑیوں کو بھگا دیا اور پھر ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔

امی جان رحم دل ہونے کی وجہ سے چڑیوں کو آٹا کھلایا کرتی تھیں اور ان کے لڑنے جھگڑنے کو ان کی عادت خیال کرتی تھیں۔ اس لیے ان کی طرف دھیان نہ دیتی تھیں لیکن آج وہ بھی کنکھیوں سے شیر اور دلیر کی لڑائی دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے بچوں کے اندازے کے ٹھیک یا غلط ہونے کا حال جاننا چاہتی تھیں۔

ان دونوں چڑوں میں شیر دلیر سے زیادہ موٹا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر دلیر پر حملے کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس مقابلے میں وہی جیت جائے گا۔ لبنیٰ بہت خوش تھی اور سلیم مایوس نظر آ رہا تھا لیکن ذرا دیر بعد ایک ایسی بات ہوئی کہ اس لڑائی کا انجام کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ گلاب کی جھاڑی میں چھپی ہوئی ایک بلی ان پر جھپٹی اور دونوں کو منہ میں دبا کر دیوار پر چڑھ گئی۔ سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے۔ بلی دیوار سے چھت پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد دونوں چڑوں کا جو انجام ہونے والا تھا، وہ سب کو معلوم تھا۔

امی نے آٹے کا کونڈا ایک طرف رکھتے ہوئے لبنیٰ اور سلیم کی طرف دیکھا جو حیران پریشان بیٹھے تھے۔ امی نے تسلی دینے کے انداز میں کہا: ''آپس میں لڑنے والوں کا انجام تو یہی ہوتا ہے۔ اس بات کو ہر وقت یاد رکھو اور اپنے سارے کام پیار محبت سے کرو۔ اللہ پاک نے انسان کو سب جان داروں کا سردار بنایا ہے، اسے عقل کا نُور دیا ہے اور عقل یہی بتاتی ہے کہ لڑنے جھگڑنے والے نقصان اُٹھاتے ہیں۔''

☆☆☆

بڑوں کے تمدن کا بچوں پر اثر

بچوں کو مہذب یا تہذیب سکھانے کے لیے ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ اپنی ذاتی زندگی میں تہذیب وتمدن کے اصولوں کا احترام کریں اور بچوں کے سامنے اپنے آپ کو ایک مہذب انسان کے طور پر پیش کریں۔ بچہ والدین اور اساتذہ کے ذاتی کردار سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اگر بڑے کھانے، پینے، بول چال، لباس اور وضع قطع میں متمدن نظر آتے ہوں تو بچہ بھی اس سے اچھا تاثر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بڑوں کی گفتگو، کھانے پینے کے اطوار اور لباس قابلِ اعتراض ہو تو بچے پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کو یہ بات پلے باندھ لینی چاہیے کہ اگر وہ بچوں کو تمدنی خطروں سے واقعی بچانا چاہتے ہیں تو اپنی ذاتی زندگی، گفتگو میں سلیقہ اور بود و باش میں خاطر خواہ اصلاح کریں۔

طارق کا دل جعفر کے خلاف غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ جعفر نے مجھے اور میری ماں کو اتنی مصیبتوں میں پھنسایا ہے۔ ہمیں فریدہ کے ابا اور امی کی نظروں میں گرا دیا ہے۔ پھر اس نے میری مس کو قید کروا دیا ہے۔ اب میں اسے اچھی طرح سے مزا چکھاؤں گا۔

جعفر شور مچانے لگا۔ طارق نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر کہا۔ ''خبردار! ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا۔ ورنہ گلا دبا دوں گا۔''

طارق کی یہ بات سن کر جعفر ڈر گیا۔ وہ پہلے بھی اسکول کے باہر طارق سے پٹ چکا تھا۔ اس لیے وہ ڈر کے مارے چپ ہو گیا، پھر بولا۔

''طارق بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''

''تم نے کیا بگاڑا ہے۔'' طارق بولا۔ ''تم نے تو کچھ نہیں بگاڑا۔ تم تو میرے بہت اچھے دوست ہو۔''

''ہاں! ہاں! میں تو تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔'' جعفر نے منت کے ساتھ کہا۔ ''اب مجھے چھوڑ دو۔'' طارق بولا۔

''تم میرے بہت اچھے دوست ہو، اسی لیے اپنے باپ سے کہہ کر مجھے مروانے لگے تھے۔ اسی لیے تو اپنے ہاتھ سے مجھے دریا میں ڈبونے لگے تھے۔ اسی لیے تو فریدہ کو میرے خلاف کر دیا اور ان کے ابا جان سے جھوٹ بول کر ہمیں وہاں سے نکلوا دیا۔''

''وہ...... میں نے تو...... نہیں کیا۔'' جعفر رُک رُک کر بولا۔

''میں تو خدا کی قسم تمہارا دوست ہوں۔''

''جھوٹی قسمیں کھاتے ہو۔'' طارق کو اور بھی غصہ آ گیا۔ اس نے زور سے تھپڑ جعفر کے منہ پر مارا، پھر بولا۔

''تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ دوست اپنے دوستوں کے ساتھ یہی سلوک تو کرتے ہیں جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔''

اس وقت باہر قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ طارق نے جلدی سے جعفر کی جیب سے رومال نکال کر جعفر کی دونوں ٹانگیں کس کر باندھ دیں۔ پھر اس کا ہاتھ گھسیٹتا ہوا بجلی کے سوئچ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں پاس ہی دروازہ تھا۔ طارق جعفر کے اوپر سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے یہاں سے ہلنے کی کوشش کی یا کچھ بولے تو تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔'' یہ کہہ کر طارق بڑی پھرتی سے اُٹھا۔ پہلے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر بجلی بجھا دی۔ یہ دونوں کام کر کے طارق پھر جعفر کے پاس آ گیا۔ اب کمرے میں اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں جعفر اور زیادہ ڈر گیا۔ وہ بولا۔ ''طارق بھائی! کیا تم مجھے مار ڈالو گے؟'' طارق کو ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم کتنے ڈرپوک ہو۔ اپنے گھر میں بھی مجھ سے ڈرتے ہو۔''

''مجھے چھوڑ دو...... طارق بھائی! خدا کے لیے چھوڑ دو۔'' جعفر نے روتے ہوئے کہا۔

''مجھے چھوڑ دو نا۔ مجھے معاف کر دو نا۔'' جعفر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہیں معاف کر دوں گا جعفر! میں اپنی مس کو چھڑوانے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ اس کمرے کی چابی کس کے پاس ہے۔''

''میں تمہیں بتا دوں گا۔ ضرور بتا دوں گا۔'' جعفر نے کہا۔ ''پہلے میری ٹانگیں کھول دو اور مجھے......''

''نہیں، جب تک تم بتاؤ گے نہیں، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ جلدی بتاؤ۔'' یہ کہہ کر طارق پھر جعفر کے سینے پر چڑھ گیا۔

جعفر اور زور سے رونے لگا۔ اس وقت دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ پہلے آہستہ پھر زور سے اور آوازیں آنے لگیں۔

''جعفر، جعفر! دروازہ کیوں بند کیا ہے؟''

طارق نے جعفر کا منہ دبا دیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا۔ ''خبردار! کوئی بات نہ کرنا ورنہ......''

''اچھا، بہت اچھا! نہیں بولوں گا۔'' جعفر نے کہا۔ طارق نے کچھ سوچا۔ پھر اُٹھ کے دروازے کی طرف گیا، دروازے پر آوازیں زیادہ آ رہی تھیں اور کوئی شخص دروازہ زور سے دھکیل رہا تھا۔ طارق نے بڑی پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر جو شخص دروازے کو دھکیل رہا تھا وہ اندر آ کر جعفر کے اوپر گرا۔ عین اس وقت طارق بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ آدمی جو جعفر کے اوپر آ کر گرا تھا پہلے تو گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ ایک دم سے کیا ہوا ہے لیکن اس کے گرنے سے جعفر کو سخت تکلیف ہوئی۔ وہ زور سے چلایا۔

''میں مر گیا۔ ہائے میں مر گیا۔'' وہ آدمی جو دراصل جعفر کا نوکر تھا۔ جعفر کی آواز پہچان کر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور بولا۔

''کیا ہوا جعفر بابو!'' جعفر درد سے کراہ کر بولا۔

''تم نے مجھے مار ڈالا الو کے پٹھے۔''

وہ آدمی جعفر کی گالیاں کھاتا دروازے کے پاس گیا۔ بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ اس روشنی میں جعفر کے نوکر نے دیکھا کہ جعفر کی ٹانگیں بندھی ہوئی ہیں اور جعفر ڈرا ہوا اور رو رہا ہے۔ اس آدمی نے جلدی جعفر کی ٹانگیں کھول دیں۔ جعفر تو پہلے ہی بھرا پڑا تھا۔ وہ طارق کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکا تھا لیکن اب اپنے نوکر پر غصہ نکالا۔ جعفر نے گالیوں کے ساتھ اس آدمی پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ چپ چاپ مار اور گالیاں کھاتا رہا، پھر بولا۔

''وہ لڑکا کہاں گیا؟''

''جہنم میں۔'' جعفر نے غصے سے جواب دیا۔ پھر ایک دم سے بولا۔

ابے الو کے پٹھے! اسے پکڑ۔ وہ بھاگ گیا۔'' یہ سن کر وہ آدمی جلدی سے اُٹھا اور طارق کو پکڑنے کے لیے دروازے سے باہر نکل گیا۔ جعفر بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

ابھی وہ چند ہی قدم بھاگے تھے کہ انہیں کئی آوازیں سنائی دیں۔

''چور پکڑا گیا۔ چور پکڑا گیا۔'' وہ آدمی اور جعفر دونوں رُک گئے۔ جعفر غصے سے دانت پیس کر بولا۔ ''پکڑا گیا حرامی کہیں کا۔ میرے سینے پر چڑھ کر مجھے مارنے لگا تھا۔ اب میں اس کی وہ پٹائی کروں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔''

جعفر کا نوکر مڑ کر بولا۔ ''جعفر بابو! تم اسے خوب مارنا، میں اسے پکڑ رکھوں گا اور تم مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دینا۔''

اپنے نوکر کی بات سن کر جعفر بولا۔ ''میں اس کو اپنے شکاری چاقو سے حلال کر دوں گا۔'' ''نہیں! حلال نہیں کروں گا۔ تم اسے پکڑے رکھنا اور میں بندوق لا کر اسے گولی مار دوں گا۔ اسے دس گولیاں ماروں گا۔ میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔ میرا گلا دباتا تھا۔ اب آیا ہے میرے قابو۔''

''ہاں! ہاں! اسے مار ڈالنا۔ تم تو اتنے بہادر ہو۔'' اپنی تعریف سنتے ہی جعفر کی گردن اکڑ گئی۔ سینہ تن گیا اور وہ اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔

اتنے میں جعفر کو اپنے ابا جان کی آواز سنائی دی، وہ بہت غصے میں تھے اور کسی کو زور زور سے مار رہے تھے۔

''اور مارو اسے۔'' جعفر کے غصے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ بھاگ کر اپنے ابا جان کی طرف گیا۔ جعفر کے مکان کے لمبے چوڑے برآمدے میں ایک طرف دو آدمیوں نے ایک شخص کو پکڑ رکھا تھا اور جعفر کے ابا اسے زور زور سے مار رہے تھے اور جعفر ہی کی طرح گالیاں دے رہے تھے۔

''اُستانی کو چھڑوانے آیا تھا۔'' جعفر کے ابا کہہ رہے تھے۔ ''تو ساری عمر یہاں سڑتا رہے گا۔ میں تجھے گولی مار کر تیری لاش کتوں کو ڈال دوں گا۔'' ابا کی ان باتوں سے جعفر کا دل طارق کو مارنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ لپک کر ادھر گیا تاکہ طارق کو مکے، تھپڑ اور ٹھوکریں مار مار کر اپنا بدلہ چکائے۔ جعفر نے دونوں آدمیوں سے جنہوں نے اسے پکڑا ہوا تھا، کہا۔

''اسے میری طرف کرو میں اس کی خبر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جعفر نے اپنا مکہ تان لیا اور جب اسے مارنے لگا تو اس نے روشنی میں دیکھا کہ وہ طارق نہیں، موٹا آدمی ہے۔ موٹے آدمی کو جعفر کے ابا کے دو آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا اور وہ زور زور سے موٹے کو مار رہے تھے۔

جعفر حیران ہو کر بولا۔ ''ابا جان! یہ کہاں سے آ گیا؟''

''یہ تمہاری اُستانی کو چھڑوانے آیا تھا۔ اس کے پاس ایک چابی بھی تھی۔ جب یہ تالا کھولنے لگا تو کالو نے اسے پکڑ لیا۔''

اپنے ابا کی پوری بات سننے سے پہلے جعفر چلّایا۔

''لیکن طارق کہاں گیا؟''

''طارق کہاں سے آ گیا؟'' جعفر کے ابا نے پوچھا۔ ''طارق ابھی کمرے سے نکل کر بھاگا ہے۔'' جعفر نے جواب دیا۔ وہ نوکر، جو کمرے میں جعفر کے اوپر آ کر گرا تھا، جلدی سے بولا۔

''جناب جی! میں نے اسے خود پکڑا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔ پھر جعفر بابو نے اس کی خوب ٹھکائی کی۔''

''جی ہاں، ابا جان! میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ پھر داؤ مار کر بھاگ گیا۔''

''اسے جلدی سے پکڑو۔ جلدی سے۔'' جعفر کے ابا نے حکم دیا۔

جعفر کے ابا اور جعفر دونوں موٹے آدمی کے پاس رہ گئے۔ موٹے کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ بے چارا نہ تو ہل سکتا تھا اور نہ کچھ بول ہی سکتا تھا۔ باقی تینوں آدمی طارق کی تلاش میں بھاگے۔

اس وقت طارق باہر کی دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا، آگے کچھ فاصلے پر روشنی تھی۔ طارق نے سوچا، اگر میں روشنی میں گیا تو پکڑا جاؤں گا اور یہاں اندھیرے میں بچا رہوں گا۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے وہ موٹے کے ساتھ آیا تھا اور موٹے نے اسے چھت پر چڑھایا تھا۔

انسان خطرے کی حالت میں بہت کچھ سوچ لیتا ہے۔ طارق کو فوراً خیال آیا کیوں نہ میں چھت پر چڑھ جاؤں۔ چھت پر چلتا چلتا کافی دُور تک چلا جاؤں گا''

یہ سوچ کر طارق دیوار کے اس حصے میں آیا جہاں دیوار کچھ ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ بڑی پھرتی سے اوپر اُٹھا۔ ٹوٹے ہوئے حصے میں اپنا پاؤں اڑایا۔ دیوار پر چڑھ گیا۔ وہاں سے چھت پر آ گیا۔

طارق چھت پر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ جب وہ روشن دانوں کے پاس سے گزرا تو اسے یاد آیا، تیسرے کمرے میں مس بند ہیں۔ اس نے دیکھا روشن دان ویسے ہی کھلا تھا۔ اس میں سے روشنی نکل رہی تھی۔

طارق نے پہلے کی طرح روشن دان میں منہ ڈال کر جھانکا۔ نیچے ایک چار پائی پر طارق کی اُستانی پڑی تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ سکڑی ہوئی تھیں۔ طارق روشن دان سے ہٹ گیا۔ اس نے سوچا مجھے جلدی بھاگ جانا چاہیے۔ کہیں وہ لوگ اوپر آ گئے تو میں پھر پکڑا جاؤں گا۔ وہ پھر گھٹنوں کے بل ہو کر چلنے لگا تھا، ایک دم سے رُک گیا۔

''میری ماں گھر میں میرا انتظار کرتی ہوں گی۔ میرے لیے پریشان ہوں گی۔'' طارق کو خیال آیا۔ فوراً ہی اس کا دل بول اُٹھا۔

''مس بھی تو ماں سے کم نہیں ہوتی۔ پھر تیری مس تو صرف تیرے لیے مصیبت میں پھنسی ہے۔''

طارق کی اُستانی کمرے میں ایک چار پائی پر پڑی تھیں۔ کئی بار اُستانی صاحبہ نے دل میں سوچا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں، جعفر کے ابا کو جھوٹ موٹ کہہ دیں کہ وہ طارق کی مدد نہیں کریں گی۔ اس طرح یہاں سے نکل کر اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے پاس جائیں، انہیں سب کچھ بتا کر پولیس میں اطلاع دے دیں اور جعفر کے ابا کو پکڑوا دیں لیکن پھر اُستانی صاحبہ نے سوچا کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں کہا۔

''میں نے ہمیشہ بچوں کو سچ بولنے کی تعلیم دی ہے۔ اگر اب میں جھوٹ بول کر یہاں سے نکل جاؤں گی تو آئندہ میری کوئی بات بچوں کے دل پر اثر نہیں کرے گی۔'' اُستانی صاحبہ، یہ باتیں سوچتے سوچتے چار پائی پر لیٹ گئیں لیکن انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ ایک تو سردی تھی۔ دوسرے انہیں بھوک لگی تھی۔ وہ چار پائی پر سمٹ کر لیٹی رہیں۔ اس وقت طارق کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

''مس! میں آ گیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کے لیے آ گیا ہوں۔''

اُستانی نے یہ آواز سنی تو جھٹ چار پائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا، پھر دروازے کی طرف دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ طارق روشن دان میں منہ ڈالے بول رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کچھ اور اندر کر لیا اور بولا۔

''مس! میں طارق ہوں...... اوپر دیکھیں۔ روشن دان کی طرف۔''

مس نے اوپر دیکھا اور روشن دان میں طارق کا چہرہ دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ پھر وہ جلدی سے چار پائی سے اُٹھیں اور روشن دان کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

طارق نے مس کو روشن دان کے نیچے دیکھا تو بولا۔

''مس! آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کو چھڑوانے آ گیا ہوں۔''

اُستانی صاحبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور ان کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے دل میں سوچا یہ ننھا لڑکا کتنا نڈر اور بہادر

ہے۔ معلوم نہیں کتنی مصیبتوں سے یہاں تک پہنچا ہے۔ طارق کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔ اتنی رات گئے۔ اس قدر سردی میں اوپر چھت پر چڑھ کر مجھے تسلی دے رہا ہے۔

''طارق بیٹے! تم کیسے آ گئے۔'' اُستانی نے آہستہ سے کہا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کی آواز کوئی سن نہ لے اور طارق بھی میری طرح پکڑا نہ جائے۔

''تم اپنے گھر جاؤ بیٹے! تمہیں کوئی دیکھ لے گا۔'' اُستانی نے کہا۔

''میں تو نیچے آپ کے پاس آ رہا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔

''نہیں، میرے پاس مت آؤ۔ اپنی امی جان کے پاس چلے جاؤ۔''

''میں آپ کو یہاں قید میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' طارق نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر طارق نے پورے کمرے کو دیکھا اور بولا۔

''وہ جو کونے میں میز پڑی ہے اسے یہاں لے آئیں، اس کے اوپر چارپائی کھڑی کر دیں۔'' اُستانی اور بھی حیران ہوئیں کہ طارق کیا کرنے لگا ہے۔ اُستانی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں طارق بھی میری طرح قید نہ ہو جائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ طارق جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ضرور کر گزرے گا۔ وہ اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک آیا ہے۔ اب یہاں میرے پاس آ کر ہی رہے گا۔

اُستانی جی نے کونے میں پڑی ہوئی میز آہستہ سے اُٹھائی۔ یہ میز روشن دان کے عین نیچے لا کر رکھ دی۔ اُدھر اوپر طارق روشن دان سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ روشن دان کا چوکھٹا اکھیڑ دے اس چوکھٹے کو اکھیڑے بغیر وہ روشن دان میں نہیں گھس سکتا تھا۔

''اُستانی صاحبہ وہ چارپائی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھیں، اُٹھا کر لائیں اور اسے میز کے اوپر کھڑا کر دیا۔ اب انہوں نے جو اوپر نظر اُٹھائی تو حیرت سے ان کا منہ کھلا رہ گیا۔ طارق نے پورا چوکھٹا اتار دیا تھا اور روشن دان کی جگہ ایک بہت بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ اس سوراخ سے طارق کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ طارق کے چہرے پر اب سرخی تھی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے۔ اس نے اتنا زور لگا کر چوکھٹا جو اکھیڑا تھا۔

اُستانی جی میز کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کھڑی کی ہوئی چارپائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اوپر طارق نے اپنی ٹانگیں بڑے سوراخ میں ڈال کر اندر لٹکا دی تھیں۔ اس کے پاؤں چارپائی سے کچھ اوپر تھے۔ یہ پاؤں ہولے ہولے چارپائی کی طرف آ رہے تھے۔ اُستانی کی نظریں طارق کے پاؤں پر تھیں اور ان کا دل کانپ رہا تھا۔ وہ بار بار دعا مانگ رہی تھی۔

''یا اللہ اس ننھے مجاہد کو حفاظت سے نیچے پہنچا دے۔'' طارق کے پاؤں چارپائی پر اوپر کے حصے پر ٹک گئے۔ اب اس نے دونوں ہاتھ اوپر سوراخ میں لٹکا رکھے تھے۔ طارق چارپائی سے اُترتا ہوا میز پر آیا اور پھر نیچے فرش پر۔ اُستانی صاحبہ نے چارپائی کو چھوڑ دیا اور طارق کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

''میرے بہادر بیٹے......!'' اس سے آگے اُستانی جی کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ''تم نے اپنے آپ کو اتنے خطرے میں کیوں ڈالا ہے۔'' اُستانی نے کہا۔

طارق نے جواب دیا۔ ''مس! خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اب آپ جلدی کریں، نہیں تو کوئی آ جائے گا۔''

''میں کیا کروں؟'' اُستانی نے پوچھا۔ پھر وہ خود ہی سمجھ گئیں اور بولیں۔ ''میں روشن دان سے کیسے نکل سکوں گی۔''

''جیسے میں نکل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' طارق نے جواب دیا۔ اُستانی صاحبہ نے سوچا اب واقعی جلدی کرنی چاہیے کیوں کہ اب میرے ساتھ طارق بھی کمرے میں بند ہے۔ اگر میں یہاں سے نہ نکلی تو طارق بھی پھنس جائے گا۔

طارق نیچے میز پر کھڑا ہو گیا۔ اُستانی صاحبہ کو چارپائی پر چڑھایا۔ اُستانی صاحبہ نے اس طرح کا کرتب پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ چارپائی پر چڑھتے ہوئے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن پھر انہوں نے اپنا دل مضبوط کیا اور جیسے تیسے بڑے سوراخ کے راستے چھت پر پہنچ گئیں۔

اب طارق بھی چارپائی پر چڑھا۔ وہ تین بار نیچے رکھی ہوئی میز ڈولی۔ طارق کو یوں لگا جیسے وہ گر جائے گا لیکن اوپر سے جب اُستانی صاحبہ نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے تو طارق کی تسلی ہو گئی۔ وہ زور لگا کر سوراخ سے باہر چھت پر آ گیا۔

طارق نے اُستانی صاحبہ کو دیوار کے راستے نیچے اُترنے اور سڑک کی طرف سے بازار میں جانے کا راستہ بتایا، پھر وہ دونوں نیچے کودنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے طارق نے اپنی مس کو نیچے اتارا۔ طارق نے کہا۔ ''آپ آہستہ سے دیوار کے ساتھ چل کر سڑک پر پہنچ جائیں۔'' اُستانی نے ایسا ہی کیا۔ اُستانی صاحبہ سڑک کے پاس جا رہی تھیں کہ اندھیرے میں انہیں ٹھوکر لگی، وہ گر گئیں۔ ان کے گرنے کی آواز گونجی۔ اس طرف جعفر کے ابا کے جو آدمی طارق کو تلاش کر رہے تھے، انہوں نے یہ آواز سن لی۔ ایک ٹارچ اندھیرے میں روشن ہوئی۔ اس وقت طارق دیوار پر سے نیچے اُترنے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ٹارچ کی روشنی ہوئی ہے اور کچھ آدمی اُستانی کے پیچھے لپکے ہیں تو طارق نے اپنی اُستانی کو بچانے کا ارادہ کر لیا۔

طارق نے دیوار پر سے چھلانگ لگا دی اور زور سے بولا۔
''آپ بھاگ جائیں جلدی سے بھاگ جائیں۔'' طارق کی زور دار آوازیں سن کر ٹارچ کی روشنی طارق کی طرف آئی۔ طارق دوسری طرف بھاگنے لگا۔ ایک آدمی بولا۔ ''ارے وہ ہے طارق۔''
''پکڑو، پکڑو۔'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ طارق کچھ دیر تک جعفر کے آدمیوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا، پھر وہ راستہ بھول گیا۔ جب آدمی اسے پکڑنے کے لیے دوڑے آئے تو طارق نے نعرہ لگایا۔
''آؤ پکڑ لو مجھے۔ میں طارق ہوں۔ میں نے اپنی مس کو بھگا دیا ہے۔''
طارق کا یہ نعرہ سن کر جعفر کے ابا کے آدمی طارق کی طرف لپکے۔ طارق بھاگنے کی کوشش کرتا رہا لیکن آخر آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔
ایک آدمی نے جلدی سے اپنی پگڑی اُتاری۔ پگڑی سے طارق کے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور اسے قیدی بنا کر جعفر کے ابا کے پاس لے چلے۔ بھاگ دوڑ کی آواز اور شور سن کر آس پاس مکانوں میں رہنے والے لوگ جاگ اُٹھے۔ کچھ لوگ لاٹھیاں لے کر بھاگے آئے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ لوگوں نے پوچھا۔
''کیا بات ہے؟''
جعفر کے ابا نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ ''چور تھا۔''
''پکڑا گیا۔'' ایک ہمسائے نے پوچھا۔
''جی ہاں۔'' کالے آدمی نے فوراً جواب دیا۔
اپنے آدمی کا یہ جواب سن کر جعفر کے ابا گھبرا گئے۔ انہوں نے سوچا۔ اگر میرے ہمسایوں کو پتا چلا کہ ہم نے کوئی چور پکڑا ہے تو وہ اسے تھانے لے جانے کا کہیں گے اور تھانے میں جا کر طارق ساری بات بتا دے گا اور الٹا میں پکڑا جاؤں گا۔ جعفر کے ابا تو یہ کسی کو بتا نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے ایک یتیم اور غریب لڑکے (یعنی طارق) کو پکڑا ہے۔
جعفر کے ابا نے سوچا اب کوئی ایسی بات کرنی چاہیے، جس سے یہ سب لوگ ٹل جائیں اور اپنے گھروں میں جا کر سو جائیں۔ انہوں نے فوراً کہا۔ ''جی ہاں! ہم نے چور تو پکڑا ہے لیکن وہ میرا اپنا نوکر ہے۔''
''ارے نوکر ہو کر چوریاں کرتا ہے۔'' ایک ہمسایہ بولا۔
''میں اس کا سر توڑ دوں گا۔'' ایک شخص نے کہا جس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا اور پستول والا نوجوان بڑے جوش سے بولا۔
''ایسے بے ایمان نوکر کو تو گولی مار دینی چاہیے۔''
''وہ ہے کہاں؟'' ایک اور شخص نے پوچھا۔
''وہاں کمرے میں ہے۔'' جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔
''اب کوئی خطرہ نہیں۔ آپ لوگوں کی بڑی مہربانی۔''
''نہیں جی، مہربانی کی کوئی بات نہیں۔'' لاٹھی والے نے کہا اور اپنی لاٹھی زور سے فرش پر ماری۔
''ہمیں ذرا دکھائیں تو سہی۔'' ایک شخص نے کہا۔
''جی خطرے کی کوئی بات نہیں۔'' جعفر کے ابا پھر جلدی سے بولے۔ ''اب آپ لوگ گھر جا کر آرام کریں۔''
''آرام تو کرتے ہی رہتے ہیں۔'' لاٹھی والا بولا۔
''بے ایمان اور چور نوکر کو دیکھے بغیر ہمیں نیند نہیں آئے گی۔'' پستول والے نے زور سے کہا۔ جعفر کے ابا نے جب یہ صورت دیکھی تو گھبرا گئے۔ انہوں نے کچھ سوچا اور ذرا دُور جا کر اپنے خاص لمبے کالے آدمی کے کان میں کچھ کہا۔ کالا آدمی وہاں سے کھسک گیا۔ جعفر کے ابا اپنے ہمسایوں سے کہنے لگے۔
''میرا تو خیال تھا کہ آپ لوگوں نے میرے لیے پہلے ہی اتنی تکلیف کی ہے۔ آپ آرام کرتے لیکن آپ میرے بے ایمان نوکر کو دیکھنے پر زور دے رہے ہیں۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ آپ حضرات اسے ضرور دیکھ لیں کیونکہ آج اس نے میرے گھر چوری کرنے کی کوشش کی ہے، ہوسکتا ہے کہ کل آپ میں سے کسی کے گھر میں نوکر بن کر چوری کر لے۔ آیئے اسے دیکھ لیں۔''
جعفر کے ابا ہمسایوں کو ساتھ لے کر اپنے مکان کے لمبے برآمدے کی طرف جانے لگے۔ اس وقت تک جعفر کے ابا کے آدمیوں نے طارق کو کسی کمرے میں بند کر دیا تھا اور اب برآمدے میں صرف موٹا آدمی پڑا تھا۔ موٹے کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے۔
تھوڑی دیر پہلے جعفر کے ابا نے لوگوں کی ضد دیکھ کر کالے آدمی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ کالا وہاں سے کھسک گیا تھا۔ وہ سیدھا اس جگہ آیا تھا جہاں موٹا پڑا ہوا تھا۔ کالے آدمی نے آتے ہی ایک کپڑا جیب سے نکالا اور اسے موٹے کے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کرنے لگا، موٹا کالے آدمی کو دیکھ کر غصے سے چیخا۔
''بے ایمان لم ڈھینگ! کچھ شرم کر۔ کچھ دن پہلے تو یتیم بچے کا خون کرنے لگا تھا پھر بیچاری اُستانی کو پکڑ کر یہاں قید کر دیا۔ اب مجھے.....''
''تجھے تو میں مار ہی ڈالوں گا۔'' کالے نے جواب دیا۔ یہ سن کر موٹے کو اور بھی غصہ آ گیا۔ وہ بولا۔ ''تو بھول گیا ہے۔ میں ہمیشہ تیری مدد کرتا تھا۔ تو نے تو خدا کو بھلا دیا تھا۔ مجھے کیا یاد رکھے گا۔''
''بک بک مت کر!'' کالے نے موٹے کو زور سے لات ماری اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگا۔ موٹے نے منہ دوسری طرف کر

لیا۔ کالے کو تاؤ آ گیا۔ اس نے دو تین مکے موٹے کے پیٹ میں مارے۔ موٹے کو بہت تکلیف ہوئی۔ وہ چلانے لگا۔

''لم ڈھینگ! تو چند روپوں کے لیے ظالم کے ساتھ مل گیا ہے لیکن یاد رکھ یتیم بچے کی آہ تجھے فنا کر دے گی۔ تجھے مرتے وقت پانی نصیب نہیں ہوگا۔ تیرا بچہ تیری نظروں کے سامنے......'' موٹا آدمی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ کالے نے مکے اور ٹھوکریں مار مار کر موٹے کو بے حال کر دیا، پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ بے چارا موٹا تھک ٹوٹ کر فرش پر لیٹ گیا۔ اس وقت جعفر کے ابا اپنے ہمسایوں کو لے کر آئے۔ کالے نے برآمدے میں لگا ہوا بلب پہلے سے اتار دیا تھا۔ جعفر کے ابا نے ٹارچ جلا کر لوگوں کو موٹا دکھایا۔

لاٹھی والا شخص آگے بڑھا۔ اس نے اپنی لاٹھی موٹے کے پیٹ میں کھبو دی، پھر بولا۔ ''الو کے پٹھے، نمک حرام! اب تو جیل میں چکی پیسے گا اور چوری کرنے کا مزا چکھے گا۔''

''جیل میں چکی پیس پیس کر اس کی ساری چربی پگھل جائے گی۔'' ایک اور ہمسایہ بولا۔ یہ سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔

دو تین آدمی اور جھکے اور موٹے کو ٹھوکریں مار کر پوچھنے لگے کہ اس نے چوری کیوں کی تھی، لیکن موٹا بے چارا کیا جواب دیتا۔ ایک تو وہ کالے کی مار کھا کر اَدھ موا ہو چکا تھا۔ دوسرے اس کے منہ میں رومال ٹھنسا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ اشارے سے بھی تو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

''چودھری صاحب! پولیس کو فون کر دیا ہے؟'' لاٹھی والے نے جعفر کے ابا سے پوچھا۔

''جی ہاں کر دیا ہے۔'' جعفر کے ابا نے جھوٹ بولا۔

''اب تک پولیس آ جانی چاہیے تھی۔'' ایک شخص نے کہا۔

''اسے ہم خود ہی تھانے لے چلتے ہیں۔'' پستول والا رعب سے بولا۔

''میرے تو سر میں سخت درد ہے۔'' جعفر کے ابا نے بہانہ بنایا۔

''مجھے بھی وہاں جانا پڑے گا۔ پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ خود ہی آ جائے گی۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' ایک آدمی زوردار جمائی لے کر بولا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''جی ہاں! آپ لوگ آرام کیجیے۔'' جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔

''اچھا! السلام علیکم۔''

''خدا حافظ۔''

ہمسائے اپنی لاٹھیاں لے کر واپس جانے لگے۔ جعفر کے ابا دل میں بہت خوش تھے کہ ان کا راز ظاہر نہیں ہوا اور لوگ ٹل گئے ہیں۔

لاٹھی اور پستول والا دونوں آدمی جب برآمدے سے کچھ دُور چلے گئے تو انہیں ایک آواز سنائی دی۔ ایک کمرے میں سے آواز آ رہی تھی۔ کوئی اندر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ دونوں رُک گئے، آواز آئی۔

''میں طارق ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔ مجھے جعفر کے ابا نے قید کر دیا ہے۔''

پستول والا رُک کر بولا۔ ''یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟''

دوسرے آدمی نے جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، فوراً کمرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میرے خیال میں اس کمرے میں سے آ رہی ہے۔ کوئی اندر بول رہا ہے۔'' پستول والے نے کہا۔

''دروازہ بھی کھٹکھٹا رہا ہے۔'' لاٹھی والا بولا۔

''آؤ دیکھیں۔'' ''چلو۔'' دونوں ہمسائے اس کمرے کی طرف جانے لگے۔ اس وقت جعفر کے ابا کا خاص آدمی باہر کا دروازہ بند کرنے آ رہا تھا۔ اس نے جب پستول اور لاٹھی والے کو کمرے کی طرف جاتے دیکھا تو گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ''ادھر نہ جائیں۔''

پستول والا کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا، حیران ہو کر بولا۔ ''کیوں میاں، کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے۔'' جعفر کے ابا کے خاص آدمی نے کہا کہ آپ اپنے گھر جائیں۔ اس کمرے کو نہ کھولیں۔

''کیوں نہ کھولیں۔'' اب لاٹھی والے نے بھی حیران ہو کر پوچھا۔

''کون ہے اندر؟'' پستول والا زور سے بولا۔

''میں طارق ہوں۔'' اندر سے آواز آئی۔ ''غریب اور یتیم لڑکا ہوں۔ مجھے جعفر کے ابا نے قید کر دیا ہے۔''

''یہ تو کسی بچے کی آواز ہے۔'' لاٹھی والے نے کہا اور دروازے پر اپنی لاٹھی ماری۔

''یہ بچہ نہیں۔'' خاص آدمی بولا۔ ''یہ خطرناک لڑکا ہے، چور ہے۔''

کچھ اور ہمسائے بھی اُدھر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے۔ اتنے میں جعفر کے ابا بھی گھبرائے ہوئے اور پریشان وہاں پہنچ گئے۔ وہ آتے ہی سمجھ گئے کہ یہاں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک ہمسائے نے جس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، دروازے پر روشنی ڈالی اور بولا۔

''دروازہ کھول کر دیکھنا چاہیے کہ اندر کون ہے۔''

''چور ہے اور کون ہے۔'' جعفر کے ابا نے جلدی سے کہا۔

''لیکن چور تو وہاں برآمدے میں پڑا تھا۔'' پستول والا بولا۔
''یہ بھی چور ہے۔ یہ بھی اس موٹے آدمی کا ساتھی ہے۔''
''یہ بھی آپ کا نوکر ہے کیا؟'' لاٹھی والے نے سوال کیا۔
''نہیں۔'' جعفر کے ابا کے خاص آدمی نے جواب دیا لیکن جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔
''جی ہاں! وہ پہلے ہمارا نوکر تھا۔ اسے ہم نے نکال دیا تھا۔''
''یہ جھوٹ ہے۔'' اندر سے طارق کی آواز آئی۔ ''یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں طارق ہوں۔ میں جعفر کا ہم جماعت ہوں۔''
''چودھری صاحب! آپ کچھ کہتے ہیں۔ آپ کا نوکر کچھ اور کہتا ہے۔'' ایک ہمسایہ بولا۔
''اس لڑکے کو باہر نکالنا چاہیے۔'' ایک آواز آئی۔
''اگر یہ لڑکا بھی چور تھا تو ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' ایک اور ہمسایہ بولا۔
''ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔'' لاٹھی والے نے کہا۔
پستول والے نے پستول کو دوسروں ہاتھ میں لیا اور اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر باہر کا کنڈا کھول دیا۔ دروازہ کھلا۔ ٹارچ کی روشنی اندر گئی اور طارق کے چہرے پر پڑی۔ لاٹھی والے نے ہاتھ بڑھا کر طارق کا بازو پکڑ لیا اور اسے باہر نکالتے ہوئے بولا۔
''سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟''
''میں طارق ہوں۔''
''تم اس چور کے ساتھ آئے تھے؟'' پستول والے نے پوچھا۔
''جی ہاں...... یہ الو کا پٹھا اسی کے ساتھ آیا تھا۔'' جعفر کے ابا نے غصے سے کہا۔
''چوری کرنے آئے تھے؟'' لاٹھی والے نے سوال کیا اور طارق بولا۔
''میں چوری کرنے نہیں آیا۔ اپنی مس کو چھڑوانے آیا تھا۔''
''بکواس کرتا ہے۔'' جعفر کے ابا نے طارق کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔
''آپ مجھے جتنا جی چاہے مار لیں لیکن میں سچ بولنے سے باز نہیں آؤں گا۔''
''کتنا دلیر لڑکا ہے۔'' ایک ہمسائے نے زور سے کہا۔
''عادی چور ہے ناں، اس لیے دلیری دکھاتا ہے۔'' جعفر کے ابا نے جواب دیا۔
''چوہدری صاحب!'' ایک ادھیڑ عمر کا ہمسایہ، جعفر کے ابا کے پاس آ کر بولا۔ ''اگر یہ لڑکا بھی چوری کرنے آیا تھا تو آپ نے اس کے متعلق ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا۔ اسے کمرے میں کیوں چھپا دیا؟''
''بات یہ ہے جناب!'' جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں پولیس میں رپورٹ کر کے اپنے گھر کی بدنامی نہیں کرانا چاہتا۔'' ادھیڑ عمر کا ہمسایہ اب طارق کے پاس آ گیا اور بولا۔
''دیکھو لڑکے! سچ سچ بتا دو۔ ورنہ تمہیں ابھی تھانے میں لے جائیں گے۔ بتاؤ تم یہاں آدھی رات کو کیوں آئے؟''
''میں نے آپ کو بتایا تو ہے میں اپنی مس کو چھڑوانے آیا تھا۔''
''کس کو؟'' پستول والا اور لاٹھی والا دونوں ایک ساتھ بولے۔
''اپنی مس کو۔ اُستانی صاحبہ کو۔''
''کہاں سے چھڑوانے آئے تھے؟'' ہمسائے نے سوال کیا۔
''یہاں سے، جعفر کے ابا نے......'' طارق نے اتنا ہی کہا تھا کہ جعفر کے ابا نے بہت زور کا مکا طارق کو مارا۔
''آپ اسے بات تو کرنے دیں۔'' ہمسائے نے جعفر کے ابا سے کہا۔
اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اُدھر طارق کی اُستانی صاحبہ گرتی پڑتی بڑی مشکل سے اسکول کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچیں۔ اس وقت سخت سردی تھی۔ اُستانی کو بھوک بھی لگی تھی اور یہ ڈر بھی تھا کہ جعفر کے ابا کے آدمی ان کا پیچھا کر رہے ہوں گے اور ان کو پھر اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اُستانی جب گھر کے قریب آئیں تو دیکھا کہ وہاں کوئی شخص چادر میں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ اُستانی کا دل ڈر کے مارے زور سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے سوچا جعفر کے ابا کے آدمی پہلے ہی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ اب وہ مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اُستانی واپس مڑ کر بھاگنے ہی لگی تھیں کہ آواز آئی۔
''اُستانی جی! میں بہت پریشان ہوں۔'' یہ آواز کسی عورت کی تھی۔ اُستانی کی جان میں جان آئی۔ وہ آگے بڑھیں اور چاند کی روشنی میں دیکھا۔ وہ عورت طارق کی ماں تھی۔
''آپ کہاں گئی تھیں؟'' طارق کی ماں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اُستانی کا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔ طارق کی ماں نے اور بھی پریشانی سے کہا۔
''میرا طارق آج گھر واپس نہیں آیا۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ میرے بیٹے کو......''
آپ کا...... بیٹا...... ابھی......'' اس سے آگے اُستانی کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ تھکن، سردی اور بھوک سے بے دم ہو کر گر پڑیں۔ باقی آئندہ

آپ بھی لکھیے

درخت کی آپ بیتی

(محمد طلحہ جمیل، جہلم)

اپنے اردگرد جمع لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میری چھاؤں میں پلے بڑھے میرے مالک کے نواسے، نواسیاں بھی آبدیدہ تھیں۔ آج دن تو اچھا تھا لیکن غم کی اس خبر نے دل کو بے مزہ کر دیا تھا۔ آج مجھے کاٹا جانا تھا۔ یہ سوچ کر میں غم گین ہوا جا رہا تھا کہ پتا نہیں میرے آنے والے دن کیسے اور کس حال میں گزریں گے۔ غم کی اس خبر کو سن کر میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے اپنا حالِ دل بیان کروں۔

کم و بیش چالیس سال پہلے میں نے اس رنگین دُنیا میں آنکھ کھولی۔ میرے اردگرد زیادہ تو نہیں، دو چار ننھے منے میرے جتنے ہی درخت تھے۔ کیا ہی سہانے دن تھے۔ میں صبح سویرے بیدار ہوتا تو سب سے پہلے اپنے پتے، شاخیں اس عظیم خدائے واحد کے آگے جھکاتا، جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ ایسے میں تسبیح و ثناء کرتے کرتے دن کا آغاز ہو جاتا۔ سورج بھیا بھی آنکھیں مسلتے مسلتے اپنی روشنی سے زمین کو منور کرتے ہیں۔ کچھ ہی لمحوں میں میرے اردگرد کھیلنے کودنے والے بچوں کا ہجوم لگ جاتا۔ وقت گزرتا گیا اور مجھے پتا بھی نہ چلا کہ ایک دن میں پرندوں کا مسکن بن گیا۔ پرندے اپنے ننھے منے بچوں کو گھونسلوں میں چھوڑ کر خود رزق کی تلاش میں چلے جاتے۔ میرا مالک مجھ سے شدید محبت کرتا تھا اور میری دیکھ بھال کے دوران اپنا کھانا پینا بھی بھول جاتا تھا۔

شب و روز اس طرح خوشی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن جب مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ میں ایک بیری کا درخت ہوں جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ واقعہ میں ہوا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب مجھ پر پھل لگنا شروع ہو گیا تو جیسے میری قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ میرا مالک مجھ سے پھل اُتار کر گلی محلے کے بچوں میں بانٹ دیتا تو مجھے نہ صرف درد ہوتا بلکہ دُکھ بھی ہوتا لیکن ایک دن ایک ساتھی درخت نے بتایا کہ ”پتھر اور کنکر ان درختوں کو ملتے ہیں جو کہ پھل دار ہوتے ہیں۔“ میری چھاؤں گھنی نہ سہی لیکن مقدور بھر میں نے اپنی زندگی میں سائے بانٹنے کی سعی کی ہے۔

میری تو مثال ایسے ہے جیسے کوئی درخت اوروں کو چھاؤں بانٹ کر خود دھوپ میں کھڑا رہتا ہے۔

اب تو میں کافی بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لوگ دن بھر میری ٹھنڈی چھاؤں تلے مزے لیتے ہیں اور رات کو پرندے تھکے ہارے اپنے نونہال بچوں کے لیے رزق تلاش کر کے گھونسلوں میں آ جاتے ہیں۔ بس دن ہو یا رات ہر وقت میرے ہاں رونق ہی رونق ہوتی ہے۔ میرے مالک نے مجھے جس محبت اور خلوص سے پالا ہے، میں بھی اسی طرح اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اپنے حسین ماضی کو یاد کر کے آج بھی میری آنکھ نم ہو جاتی ہے۔

یہ لوگ جو مجھے آج کاٹنے جا رہے تھے، نہ جانے اس قدر بے حس کیوں ہو چکے ہیں۔ میرے چیخنے، چلّانے کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بس اب مجھے اس آرے کا انتظار ہے جو مجھے کاٹنے کے لیے استعمال کیا جائے گا اور میری چیخ پکار کوئی نہیں سنے گا۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

رزق

(فتح محمد شارق، نوشہرہ)

کسی گاؤں میں ایک صوفی رہتا تھا۔ وہ بہت سادہ لوح تھا۔ اس کی سادگی کے قصے دُور دُور تک مشہور تھے۔ ایک مرتبہ یہ صوفی ایک مولوی صاحب کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ رزق کا وعدہ اللہ نے فرمایا ہے، وہ اپنی مخلوق کو ہر حالت میں روزی پہنچاتا ہے۔ صوفی صاحب مجلس سے اُٹھے اور دل میں ارادہ فرمایا کہ اس بات کا مشاہدہ کریں گے۔ چناں چہ دوسرے روز وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر شہر سے باہر جنگل میں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے اور دل میں سوچا کہ ”وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ دیکھتا ہوں اللہ اپنی قدرت سے مجھے کیسے روزی عطا کرتا ہے۔“

صوفی کو بیٹھے بیٹھے عصر کا وقت ہو گیا، کھانے پینے کا کوئی

بندوبست نہ تھا اور بھوک ستانے لگی مگر مولوی صاحب کی باتوں کو آزمانے کے لیے وہیں جمے بیٹھے رہے۔ شام تک تو بھوک سے بُرا حال تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ اس خیال کو دل سے نکال کر گھر چلے جائیں مگر چوں کہ انہوں نے مولوی صاحب کی باتوں کو آزمانا تھا۔ اس لیے دل مضبوط کر کے وہیں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ درخت پر چڑھ گئے کہ کوئی اللہ کا بندہ نظر آ جائے۔

تھوڑی دیر بعد ایک دیہاتی ان کو روٹی دینے کے لیے آیا۔ اصل میں وہ شام کو گھر جاتے ہوئے صوفی کو دیکھ گیا تھا۔ اس نے انہیں مسافر سمجھا اور گاؤں کے دستور کے مطابق ان کے لیے کھانا لایا۔ صوفی نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ ”واقعی اللہ اپنی مخلوق کو کسی نہ کسی طرح روزی ضرور پہنچاتا ہے۔“ انہوں نے سوچا کہ نیچے اُتر کر دیہاتی سے روٹی لے لوں مگر پھر سوچا کہ ”نہیں! اس طرح تو رزق حاصل کرنے میں تمہاری محنت شامل ہو جائے گی۔ تم خاموشی سے انتظار کرو۔ جب روزق گاؤں سے یہاں پہنچ سکتا ہے تو کیا اتنی بلندی تک نہیں آ سکتا؟“ وہ خاموشی سے درخت پر بیٹھے ہوئے دیہاتی کو دیکھتے رہے۔ دیہاتی نے جب مسافر کو نہ پایا تو مایوس ہو کر پلٹنے لگا۔ اب اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ صوفی نے سوچا کہ اگر یہ واپس چلا گیا تو ساری رات مجھے بھوکا رہنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے آہستہ سے کھنکارا۔

دیہاتی ان کی آواز سن کر پلٹا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ سوچا کہ شاید کوئی جنگلی جانوروں سے جان بچانے کے لیے درخت پر چڑھ گیا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے صوفی کو کھانا دیا اور اپنی راہ لی۔ صوفی نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ نیچے آ کر ندی سے پانی پیا۔ جب کچھ جان میں جان آئی تو سیدھا مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہا۔ ”آپ کی بات اس حد تک تو صحیح نکلی ہے کہ اللہ عزوجل جنگل تک گاؤں سے روزی پہنچاتا ہے مگر اسے حاصل کرنے کے لیے انسان کو کھنکارنا پڑتا ہے، ورنہ روزی واپس چلی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ساری نعمتیں اللہ ہی دیتا ہے مگر ان کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

دیوار اور کیل

”نہیں، مجھے کھانا نہیں کھانا، جب مجھے ضرورت ہوگی تو میں کھا لوں گا۔ آپ اپنا کام کریں۔“ زین نے انتہائی غصے سے امی جان سے کہا تو پاس بیٹھی علینہ سے رہا نہ گیا۔ ”بھیا! آپ کو پتا ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟“ زین نے بدتمیزی سے بہن کو بھی جھڑک دیا۔ ”مجھے پتا ہے، تم اپنی زبان بند رکھو۔“ امی جان افسوس سے دیکھ کر رہ گئی اور پُرسوچ انداز میں اُٹھ گئی۔ شام کو ابو جان کو ساری بات بتائی۔ ابو جان بھی زین کی بداخلاقی کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ زین کا کوئی دوست نہیں تھا کیوں کہ وہ بہت اکھڑ مزاج اور غصے والا لڑکا تھا۔ ہر کوئی اس سے خائف رہتا تھا۔ ایک دن ابو جان کو ایک ترکیب سوجھی تو انہوں نے اس پر عمل کا فیصلہ کیا۔ ابو جان نے ایک تھیلی میں کچھ کیلیں ڈال کر اسے دیں کہ آئندہ جب بھی تم اپنے کسی دوست یا کسی سے بھی اختلاف رائے رکھو تو گھر آ کر باغیچے کی دیوار پر جا کر ایک کیل گاڑ دیا کرو۔

زین نے ایسا ہی کیا ہوا۔ پہلے دن باغیچے کی دیوار پر سینتیس کیلیں گاڑ دیں۔ اگلے دن سے اس نے بار بار باغیچے میں جا کر دیوار پر کیل ٹھونکنے کے بجائے اپنے آپ پر کنٹرول کرنا شروع کر دیا۔ روزانہ دیوار پر لگائی جانے والی کیلوں کی تعداد کم سے کم ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ ایک دن اس نے ایک بھی کیل دیوار میں نہ لگائی۔ شام کو زین نے ابو جان کو خوشی سے بتایا کہ میں نے آج ایک بھی کیل دیوار میں نہیں لگائی۔

ابو جان اس تبدیلی سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ تم نے ایک اور کام کرنا ہے۔ سارا دن اگر تم اپنے آپ پر مکمل کنٹرول رکھ لو تو اس دن جا کر دیوار سے ایک کیل واپس نکال لیا کرنا۔ اس کام میں دن تو بہت سے لگے مگر آخر کار وہ دن آ پہنچا جب زین دیوار سے ساری کیلیں واپس نکال چکا تھا۔

پھر ابو جان، زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے باغیچے کی دیوار کے پاس لے گئے اور کہا۔ ”بیٹے، بے شک تم نے اس عرصے میں اپنے غصے اور مزاج پر قابو پا کر بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے مگر اس دیوار کو دیکھو جس میں کیلوں کے گاڑنے اور اکھاڑنے سے پڑنے

والے بدنما نشان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ گئے ہیں اور یہ دیوار اب دوبارہ کبھی ویسی نہ ہو سکے گی جس طرح کہ پہلے تھی۔ بالکل اسی طرح جب تم اپنے معاملات میں دوسروں کی اختلاف رائے کے دوران یا غصے کی حالت میں تندوتیز باتیں یا بدزبانی کرتے ہو تو ان پر گہرے اور بُرے اثرات چھوڑ دیتے ہو۔ خنجر سے لگا ہوا زخم مندمل ہو جائے گا، تمہاری معافی اور التجا سے اس شخص کے ساتھ تمہارے تعلقات بھی دوبارہ بحال ہو جائیں گے مگر زبان کے لگے ہوئے زخم تو کیل کے لگے ہوئے زخموں سے بھی زیادہ دلوں پر گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ دوست نایاب ہیروں اور بیش قیمت جواہرات کی مانند ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو، کیوں کہ اس کے لگائے ہوئے گھاؤ مندمل نہیں ہوں گے۔''

ابو جان کی بات سن کر زین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے سوچا کہ اس نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زخم دیے ہیں۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے

(محمد عدنان اقبال، تاندلیانوالہ)

احمد کی ماں اور اس کی دو جواں سال بہنیں آج بہت خوش تھیں۔ تینوں گھر کی اچھی طرح صفائی کرنے کے بعد مزے مزے کے پکوان بنانے میں مصروف تھیں کیوں کہ آج سکینہ کا اکلوتا بیٹا، نسرین اور کرن کا بھائی دو سال کے بعد آرمی سے دو ماہ کی چھٹیاں لے کر واپس آ رہا تھا۔ اچانک ڈور بیل بجی۔ کرن نے دروازہ کھولا تو سامنے کیپٹن احمد سامان کے ساتھ لدا پھندا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کرن کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔ اندر سے اس کی ماں سکینہ اور بہن نسرین دوڑتی ہوئی باہر نکلیں۔ ماں نے بیٹے کا ماتھا چوما اور نسرین نے بھائی سے سامان کا بیگ پکڑا اور اندر آ گئے۔ رات کو سارے خاندان نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر تحفے تحائف کا سلسلہ شروع ہوا۔ کرن کے لیے سونے کی چوڑیاں اور نسرین کے لیے کانوں کے جھمکے آئے تھے۔ احمد ماں کے لیے عمدہ کڑھائی والی چادر لایا تھا۔ سکینہ بولی۔ ''بیٹا! رات بہت ہوگئی ہے اب تو آرام کر لے۔''

علی الصبح ریڈیو پاکستان سے نیوز کاسٹر بار بار یہ اعلان کر رہا تھا کہ انڈین فورسز نے پاکستانی بارڈر پار کر لیا ہے اور پاک بھارت جنگ چھڑ چکی ہے، لہٰذا تمام پاکستانی آفیسرز اور جوانوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی یونٹس میں پہنچ جائیں۔ جب یہ آواز احمد کے کانوں میں پہنچی تو اس نے اپنی ماں سے اجازت چاہی اور بولا۔ ''اماں تو دعا کر کہ تیرا بیٹا ملک کے کام آئے۔'' ماں آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی کہ بیٹا تو اپنے شہید والد کے نقش قدم پر چلنا اور گولی سینے پر کھانا اور بزدلوں کی طرح پیٹھ نہ پھیرنا۔ احمد واپس چلا گیا۔

فوج کے اعلیٰ کمانڈر نے تمام آفیسرز اور جوانوں کو جنگی ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ''اے پاک دھرتی کے جانباز سپوتو! یہ کڑے امتحان کا وقت ہے۔ دشمن نے ہمیں للکارا ہے۔ دشمن کو بتا دو کہ ابھی اس دھرتی کے شاہین زندہ ہیں اور اس دھرتی کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔'' سب نے حلف دیا کہ ہم مرتے دم تک وطنِ عزیز سے وفاداری کا ثبوت دیں گے اور اس کی حفاظت کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔

کیپٹن احمد اور اس کے ہمراہ چند دیگر آفیسرز اور جوانوں کو اعلیٰ حکام نے یہ مشن سونپا تھا کہ بھارتی سرحد کے اندر گھس کر دشمن کے ان ٹھکانوں کو تباہ کرنا جہاں سے انڈین فورسز کو اسلحہ اور دیگر امدادی سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ یہ کام انتہائی خطرناک اور جان لیوا تھا۔ کیپٹن احمد نے مشن سٹارٹ کرنے سے پہلے اپنی ٹیم کو ضروری ہدایات دیں اور پھر وطن کے یہ جانباز سپاہی رات کے اندھیرے میں انڈین سرحد پار کر کے اندر گھس گئے۔ 10 کلومیٹر تک وطن کے یہ سپوت رینگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ کیپٹن احمد سب سے آگے تھا۔ انڈین فوجی بھاری اسلحہ سے لیس اس ڈپو کی حفاظت پر مامور تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سرچ لائٹ جلا کر دیکھا جاتا تھا کہ کہیں کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا۔

اچانک پاکستانی شاہینوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے مشین گنوں کی مدد سے بھارتی فوجیوں پر ہلہ بول دیا۔ پلان یہ تھا کہ 12 لوگ دشمن کے فوجیوں پر حملہ کریں گے اور باقی لوگ دستی بموں اور راکٹ لانچرز کی مدد سے اس ڈپو کو تباہ کر دیں گے۔ دشمن کی گنیں بھی گولیاں برسانے لگیں۔ ہر طرف آگ کے شعلے برسنے لگے اور خون پانی کی مانند بہنے لگا۔ دشمن کے فوجی بوکھلاہٹ کا شکار

ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ دشمن کے کئی فوجی مارے جا چکے تھے اور 15 پاکستانی سپوت بھی شہید ہو چکے تھے۔

اچانک کیپٹن احمد نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے ڈپو پر حملہ کر دیا۔ کیپٹن احمد اور اس کے ساتھی ڈپو پر بم پھینکنے لگے۔ اتنے میں دشمن کی چند گولیاں کیپٹن احمد کے سینے کو چھلنی کرتیں ہوئیں دوسری طرف نکل گئیں اور خون فوارے کی مانند بہنے لگا مگر وہ اپنا مشن مکمل کر چکا تھا۔ دشمن کی کمر ٹوٹ چکی تھی کیوں کہ بھارتی ڈپو شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ زمین پر گرتے ہوئے کیپٹن احمد نے کلمہ شہادت پڑھا اور اس کے ذہن میں وہ بول گونج اٹھے جو وہ بچپن میں اکثر سنا کرتا تھا۔

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے

یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

میں ایک چھٹی بھی ضائع نہ کرتا

(طوبیٰ وحید، ہری پور)

''اسامہ...... اسامہ! چھت سے نیچے آؤ، پچھلے دو گھنٹوں سے تم پتنگ اُڑا رہے ہو اور آج تو دھوپ بھی اتنی تیز ہے، تمہیں لُو لگ جائے گی۔'' امی نے اسامہ کو چھت سے بلایا۔ ''امی جان! بس ابھی آیا۔'' اسامہ کچھ ہی دیر میں نیچے آ گیا۔ ''امی، آپ نے مجھے اتنی جلدی کیوں نیچے بلا لیا، ابھی تو مجھے پڑوس والے عبداللہ کی پتنگ بھی کاٹنی تھی۔'' ''اسامہ! اب تم بس بھی کر دو، تم نے تو دن میں چار سے پانچ گھنٹے پتنگ اُڑانا معمول ہی بنا لیا ہے اور شام تک باہر فٹ بال کھیلنے میں گزار دیتے ہو، آخر تم چھٹیوں کا کام کب شروع کرو گے۔'' ''امی، آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی تو چھٹیوں کا صرف ایک مہینہ گزرا ہے اور پورے دو مہینے باقی ہیں۔ آخری مہینے میں آپی اور بھائی اپنی پڑھائی سے فارغ ہوں گے تو وہ مجھے ہوم ورک کروا دیں گے۔''

''ہاں! وہ تمہیں ہوم ورک کروا دیں گے مگر اب تم اتنے چھوٹے تو نہیں ہو کہ وہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر ہوم ورک کروائیں گے۔ ٹھیک ہے کر لو ان کا انتظار، مگر خیال رکھنا کہ تب تک بہت دیر نہ ہو جائے۔''

''آپی...... بھائی! آپ لوگ کب آئے؟'' اسامہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ ''ہم تو پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اِدھر آؤ، ہمارے پاس بیٹھو۔'' آپی نے دوبارہ سانس لیے بغیر پوچھا۔ ''تم اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو اور تمہارا رنگ بھی کالا ہو گیا ہے۔'' اسامہ فوراً بولا۔ ''نہیں، نہیں...... آپی! ایسی بات نہیں ہے۔'' اس پر بھائی بولا۔ ''ہاں...... ہاں! چھوڑیں آپی ان سب باتوں کو، اس سے پوچھیں کہ اس کا ہوم ورک کہاں پہنچا ہے۔'' ''آپی، وہ ہوم ورک تو میں آج سے شروع کروں گا۔ میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اب آپ مجھے روزانہ ایک سبق سمجھا دیا کرنا، پھر میں لکھ لوں گا۔ بآسانی میرا ہوم ورک چھٹیاں ختم ہونے سے دو دن پہلے ختم ہو جائے گا۔'' اسامہ کی اتنی لمبی دلیلیں سننے کے بعد آپی بولی۔ ''ہاں! ٹھیک ہے، اسامہ مگر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ تم دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے کے بعد ہوم ورک کرو۔'' ''اچھا آپی، اب چھوڑیں ناں...... کل سے ہوم ورک شروع کریں گے۔ آج آپ کے آنے کی خوشی میں چھٹی۔''

''اچھا! ٹھیک ہے۔'' آپی بولی۔

اگلے دن اسامہ نے صبح ناشتہ کرنے کے فوراً بعد سائیکل لی اور اپنے ہوم ورک کے لیے شیٹیں، کاپیاں اور پین وغیرہ لینے مارکیٹ چلا گیا۔ اسامہ سامان لینے کے بعد جیسے ہی مارکیٹ سے نکلا تو ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اسامہ کو ٹکر مار کر نکل گئی۔ لوگوں نے فوراً اسامہ کو اسپتال پہنچایا۔ کچھ ہی دیر میں اسامہ کے گھر سے بھی سب لوگ آ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن اسامہ کی ریڑھ کی ہڈی تھوڑی متاثر ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اسے کم از کم ایک مہینہ بستر پر آرام کرنا ہو گا۔ اسامہ کو شام تک ہوش آ گیا۔ ایک ہفتہ اسپتال رہنے کے بعد اسامہ کو چھٹی مل گئی۔ اسامہ گھر پہنچا تو اسے اپنے ہوم ورک کا خیال آیا، وہ کافی پریشان ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں کافی شرمندہ تھا کہ کیسے اس نے دو ماہ کی چھٹیاں یوں ہی ضائع کر دیں مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ بے حد شرمندگی کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر چھٹیاں ختم ہوئیں۔ اسامہ صحت یاب ہو گیا اور اسکول جانے لگا۔ اسکول کھلنے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ہونے والے امتحان میں اسامہ کو بہت بُرے نتیجے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف اسامہ کی لاپروائی تھی جو اس نے چھٹیوں میں کی تھی۔ اب اسامہ جان چکا تھا کہ وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ بڑے ہمیشہ ہمارے فائدے کی بات کرتے ہیں، اس لیے بڑوں کا کہنا ماننا چاہیے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

محمد محمود عالم (ایم ایم عالم) کی شخصیت ہماری ملّی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش کردار ہیں۔ انہوں نے قیامِ پاکستان سے قبل 6 جولائی 1935 کو کلکتے کے ایک پڑھے لکھے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ انہیں گھر کے ماحول کے باعث کتابوں کی دوستی ملی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں صرف کرتے۔

جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو والدین کے ہمراہ انہوں نے ڈھاکہ کے مشہور نیو گورنمنٹ ہائی اسکول سے دوبارہ تعلیمی رشتہ جوڑا۔ انہوں نے یہاں تمام امتحانات امتیازی حیثیت میں پاس کیے۔ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ خصوصاً کھیل کے شعبے میں تو ان کی کارکردگی ہمیشہ قابلِ تعریف رہی۔

میٹرک کے بعد والد کی خواہش تھی کہ وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنے کے لیے بہترین تعلیمی ادارے میں داخلہ لے۔ اس کامیابی کے بعد ہی وہ اعلیٰ افسر بن سکتا ہے، مگر انہیں افسری کہاں پسند تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گویا ان کی منزل ہی کچھ اور ہے۔ وہ پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کر کے ملک کا دفاع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پرواز اور جہاز ان کا بچپن کا خواب تھا۔ وہ بچپن میں ہی اکثر جہازوں کو اُڑتا دیکھ کر خود سے پورے یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے: ''ایک دن میں بھی ہوا میں پرواز کروں گا۔''

انہوں نے والد کی خواہش کے آگے سر جھکا کر فرسٹ ائیر میں داخلہ لے لیا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ طبیعت پر بوجھ ہے۔ پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کے وہ منتظر تھے۔ پاک فضائیہ کو جوان درکار تھے۔ انہوں نے بھی وہاں کے لیے اپنا نام پیش کر دیا۔ ان کے اس فیصلے پر گھر والوں اور دوستوں کی جانب سے اچھا ردِعمل نہیں ہوا۔ سب کا خیال تھا کہ ڈاکٹر، انجینئر یا اعلیٰ افسر بن کر اپنی زندگی بڑے عیش و آرام کے ساتھ گزار سکتے ہیں......! مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عیش و آرام کے بجائے ملک و قوم کے دفاع کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکے تھے۔

2 اکتوبر 1953ء ان کی زندگی کا یادگار دن تھا جب انہوں نے پاک فضائیہ میں کمیشن حاصل کیا اور اس کا حصہ بن گئے۔ انہوں نے یہاں کئی کورس بھی کیے جن میں کامیابی ان کا مقدر ٹھہری۔ وہ اپنے خوابوں کے دیس پہنچ گئے تھے مگر ابھی انہیں اپنی

صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع نہیں مل رہا تھا۔ قدرت ان پر مہربان تھی۔ جلد ہی ایک ایسا موقع آیا تھا جس نے انہیں تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ ہوا یوں کہ 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارت کے اس اچانک حملے نے پوری قوم کو پریشانی میں مبتلا کر دیا مگر قوم کے جذبے اور پاک فوج کی طاقت سے اسے منہ توڑ جواب ملا۔

اگلے دن 7 ستمبر 1965ء کو بھارت کے دس ہنٹر طیارے سرگودھا کے ہوائی اڈے کو نشانہ بنانے کے لیے بھیجے گئے۔ سرگودھا کے ائیربیس پر پاک فضائیہ کی دفاع کی ذمہ داری اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم کے ذمے تھی۔ وہ تو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کسی ایسے ہی دن کے منتظر تھے۔ دشمن کے طیارے دیکھ کر ان کے رگ و پے میں ایک نئی طاقت آ گئی۔ اس دن وہ ''پلٹ کر جھپٹنا اور جھپٹ کر پلٹنا'' کی پوری مثال کر بن کر فضا میں اُڑے۔ اس لمحے کی داستان ان کے ساتھی امتیاز احمد بھٹی کے الفاظ میں پڑھیے:

''سات ستمبر کی صبح تین بجے پہلا حملہ اور دوسرا دوپہر کے بعد سرگودھا پر کیا گیا۔ ہمیں فوری طور پر تیاری کا حکم ملا۔ بھارتی ائیرفورس چھ چھ جہازوں پر مشتمل فارمیشن میں حملہ کرتے تھے، جن میں سے چار جہاز حملے کے لیے استعمال ہوتے تھے جب کہ بقیہ دو جہاز ان چار جہازوں کے دفاع کے لیے۔ ہم نے حملہ شروع کیا تو کڑانہ پہاڑیوں پر ایک انڈین جہاز میرے حملے کی زد میں آیا۔ میں اس پر گولیاں برسانے لگا تو میں نے دیکھا کہ بھارتی جہاز کے عین نیچے ایم ایم عالم کا جہاز تھا جس پر میں نے فوری طور پر فائرنگ کا ارادہ بدل دیا، تاہم ایم ایم عالم نے انڈین جہاز کو میزائل مار کر تباہ کر دیا۔ کچھ آگے تو لالیاں کے مقام پر انڈین جہازوں پر مشتمل ایک اور فارمیشن سے ہماری مڈھ بھیڑ ہوگئی جو کہ حملہ کے لیے سرگودھا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایم ایم عالم نے اپنا جہاز ان کے پیچھے لگا دیا اور ان پر ہلہ بول دیا جب کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ دشمن کے طیارے مار گرائے۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ اس روز ایم ایم عالم نے محض تیس سیکنڈ میں دشمن کے پانچ طیارے تباہ کر کے عسکری تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ بعد میں یہ ریکارڈ مشہور عالمی جریدے ''گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' کا بھی حصہ بنا۔ انہیں ایک دن قبل 6 ستمبر کو اس کارنامے پر انہیں ایک اور ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔ وہ اب تک پاک فضائیہ کی تاریخ میں واحد سپوت ہیں جنہیں ایک تمغہ دو مرتبہ اور وہ بھی ایک دن کے وقفے سے عطا کیا گیا۔ انہوں نے مجموعی طور پر دشمن کے نو ہنٹر طیارے تباہ کیے تھے۔ اس جنگ میں ناقابلِ فراموش کردار اور جذبہ حب الوطنی کی وجہ سے انہیں ''لٹل ڈریگن'' کہا جانے لگا۔

6 ستمبر تا 23 ستمبر 1965ء تک 17 دن کی اس جنگ میں پاک فضائیہ کے سرفروشوں نے 110 بھارتی طیاروں کو تباہ کر دیا جب کہ اس کے مقابلے میں پاکستان کو صرف 19 طیاروں کا نقصان ہوا۔ اس جنگ کے اختتام کے بعد کئی دنوں تک ایم ایم عالم کا نام اور کارنامے لوگوں کی زبان پر رہے۔

اس کے بعد ایم ایم عالم پاک فضائیہ کی جانب سے کئی محاذوں پر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان میں مقبوضہ کشمیر کا محاذ بھی شامل ہے جہاں انہوں نے شہادت کی آس لیے دشمن کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

1982ء میں پاک فضائیہ کو انہوں نے خیرباد کہہ دیا۔ اب وہ اپنی مجاہدانہ کارروائیوں میں انفرادی حیثیت سے شریک ہوئے۔ شوق شہادت کبھی انہیں مقبوضہ کشمیر لے جاتا اور کبھی وہ افغانستان میں غیرملکی تسلط کے ساتھ برسرِ پیکار نظر آتے۔

آخری دنوں میں وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں صرف کرتے رہے۔ 18 مارچ 2013ء کو پاک فضائیہ کا یہ مجاہد اور عسکری تاریخ کا ناقابلِ فراموش کردار کراچی میں انتقال کر گیا۔ اس وقت ان کی عمر 78 سال تھی۔ ان کی زندگی ہی میں لاہور کے علاقے گلبرگ کی ایک سڑک کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک نے 20 مارچ 2014ء کو ان پر یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا، جس کا ڈیزائن عادل صلاح الدین نے بنایا۔ اسی روز میاں والی ائیربیس کا نام تبدیل کر کے ''ایم ایم عالم ائیربیس'' رکھ دیا گیا۔

☆☆☆

فاختہ اور کبوتر

تصور عباس

''بی فاختہ کیا تمہیں پتا ہے ٹامی کبوتر تم سے دوستی توڑنے والا ہے۔'' کوے نے فاختہ سے پوچھا۔

''نہیں تو...... مجھے تو نہیں پتا...... اور ٹامی کبوتر ایسا کر بھی کیسے سکتا ہے۔ ہم پچھلے ایک سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں، اس نے تو کبھی ایسا سوچا تک بھی نہیں۔'' بی فاختہ نے جواب دیا۔

''نہیں بی فاختہ، وہ تم سے دوستی توڑنے والا ہے۔ اس نے جنگل کے وسط میں اپنا الگ گھونسلا بھی بنا لیا ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا ہے، اور مجھے یہ بھی کہا ہے کہ بی فاختہ سے نہ کہنا۔'' چالاک کوے نے بی فاختہ کے کان بھرتے ہوئے کہا تو بی فاختہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ پچھلے جاڑے کے موسم میں جنگل میں ایک شدید قسم کا طوفان آیا تھا اور مسلسل تین دن تک لگاتار بارش ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ تیز سرد ہوائیں بھی چلتی رہیں تھیں جس کی وجہ سے جنگل کے اکثر پرندوں کے گھونسلے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ ان میں ایک گھونسلا بی فاختہ کا بھی تھا جو ٹوٹ کر گر چکا تھا اور بارش کا پانی اسے بہا کر کہیں دُور لے گیا تھا اور اس کے ساتھ بی فاختہ کے انڈے بھی گر کر ٹوٹ گئے تھے۔ بی فاختہ کو اتنا گھونسلے کے گر جانے کا دکھ نہیں تھا جتنا انڈوں کے ٹوٹ جانے کا غم تھا۔ بی فاختہ سردی کی ماری چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ تین دن بعد جب دھوپ نکلی تو بی فاختہ کی جان میں جان آئی اور وہ دھوپ سینکنے اور اپنے جسم کو خشک کرنے کے لیے اسی درخت پر آن بیٹھی جس پر پہلے اس کا گھونسلا تھا جو طوفان اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ بی فاختہ بہت اداس بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب وہ اتنی جلدی کیسے نیا گھونسلا بنائے گی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اوپر سے ٹامی کبوتر آن پہنچا جو بی فاختہ کے ساتھ دوسرے درخت پر رہتا تھا۔ اس نے جب بی فاختہ کو پریشان دیکھا تو وجہ پوچھی۔ پہلے تو بی فاختہ نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن ٹامی کبوتر بہت رحم دل تھا۔ جب اس نے اصرار کیا تو بی فاختہ نے تمام کہانی ٹامی کبوتر کو سنائی جسے سن کر وہ بھی بہت پریشان ہوا اور اس نے بی فاختہ کو اپنے گھونسلے میں رہنے کی پیش کش کی۔ وہ ٹامی کبوتر کی ہمدردی سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے ٹامی کبوتر کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا کیوں کہ ٹامی کبوتر کا گھونسلا کافی مضبوط اور کھلا تھا۔ اس کے علاوہ بی فاختہ کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیوں کہ پچھلے تین چار دن سے سردی میں رہ رہ کے بی فاختہ کافی کم زور ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ٹامی کبوتر کے ساتھ رہنے لگی اور وہ دونوں بہت اچھے دوست بن گئے۔

وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آتے اور مل جل کر دانے دنکے کی تلاش میں جاتے اور اکٹھے واپس آتے۔ کچھ ہی دن بعد بی فاختہ نے انڈے دیے اور ان میں سے تین ننھے منے فاختہ کے بچے نکلے جنہیں دیکھ کر فاختہ اور کبوتر بہت خوش ہوئے۔ اب بی فاختہ گھونسلے

میں رہتی اور ٹامی کبوتر ان کے لیے دانہ دنکا ڈھونڈ کے لاتا۔ کبھی ٹامی کبوتر گھونسلے میں رہ کر بی فاختہ کے بچوں کا دھیان رکھتا اور بی فاختہ دانہ دنکا لینے نکل جاتی۔ جس درخت پر بی فاختہ اور کبوتر کا گھونسلا تھا، اسی درخت کے ساتھ ہی شیشم کے ایک درخت پر ایک چالاک کوا رہتا تھا۔ جب اس کو پتا چلا کہ بی فاختہ کے بچے نکلے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا کہ وہ کسی دن بی فاختہ کے بچے کھا کے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرے گا۔ اب وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا کہ کب ٹامی اور بی فاختہ گھونسلے سے جائیں اور وہ اپنے خطرناک ارادے کو عملی جامہ پہنائے مگر بی فاختہ اور ٹامی کبوتر کبھی بھی ایک ساتھ نہیں نکلتے تھے، ان میں سے کوئی ایک ضرور بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ چنانچہ چالاک کوا ان کی دوستی سے جلنے لگا اور ان کی دوستی تڑوانے کے لیے منصوبے بنانے لگا۔ اچانک اس کے شیطانی دماغ میں ایک ترکیب آئی۔

آج جب بی فاختہ اپنے گھونسلے سے نکل کر اوپر والی ٹہنی پر بیٹھی دھوپ کے مزے لے رہی تھی تو کوا اس کے پاس پہنچا اور اسے ٹامی کبوتر کے خلاف خوب بھڑکایا۔ بی فاختہ کوے کی باتوں میں آ گئی اور اس نے چالاک کوے کی باتوں پر بغیر سوچے سمجھے یقین کر لیا۔ اب بی فاختہ کے دل میں بھی ٹامی کبوتر کے لیے شدید نفرت پیدا ہونے لگی اور اس نے فوراً وہ گھونسلا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے تینوں بچوں کو ساتھ لیا اور فوراً وہاں سے اُڑ کر جنگل کے دائیں طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں آ گئی۔ چالاک کوا یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اِدھر جب شام ڈھلے ٹامی کبوتر واپس گھونسلے پہ آیا تو بی فاختہ اور اس کے بچوں کو نہ پا کر بہت حیران و پریشان ہوا اور پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن بی فاختہ وہاں ہوتی تو اسے نظر آتی۔ اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ جلدی سے کوے کے گھونسلے پر گیا اور پوچھا: ''کیا آپ نے بی فاختہ کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں دیکھا لیکن بی فاختہ کی آواز سنی تھی جو شاید اپنے بچوں سے کہہ رہی تھی کہ مجھے اب ٹامی کبوتر سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہم اس کے ساتھ کبھی نہیں رہیں گے۔'' چالاک کوے نے ٹامی کبوتر کے بھی کان بھر دیے لیکن ٹامی کبوتر بہت سمجھ دار تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ضرور کوے کی کوئی شرارت ہو گی۔ اتنے میں کافی اندھیرا چھا گیا۔ ٹامی کبوتر پریشانی کے عالم میں گھونسلے میں جا کر بیٹھ گیا۔ نیند آج اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کو رہ رہ کر بی فاختہ اور اس کے بچوں کا خیال آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے؟ بس یہی پریشانی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔

اگلی صبح جیسے ہی تھوڑی سی روشنی ہوئی ٹامی کبوتر بی فاختہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا کیوں کہ وہ ہر حال میں بی فاختہ اور اس کے بچوں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سارا جنگل چھان مارا لیکن اسے بی فاختہ اور اس کے بچوں کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ وہ تھک ہار کر واپس لوٹ ہی رہا تھا کہ جنگل کے دوسری طرف سے گزرتے ہوئے اچانک اس کی نظر بی فاختہ پر پڑی جو وہاں چھوٹی چھوٹی خشک جھاڑیوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر ٹامی کبوتر کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور فوراً بی فاختہ کے پاس جا بیٹھا۔ بی فاختہ کے ننھے منے بچے بھی پَروں کے نیچے دبکے بیٹھے تھے۔

''بی فاختہ!'' کبوتر کو دیکھ کر بی فاختہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا جس سے کبوتر کو یقین ہو گیا کہ کوئی بات ضرور ہے جو بی فاختہ اس قدر خفا ہے۔ ٹامی کبوتر نے پوچھا کہ بی فاختہ کیا بات ہے؟ تم نے یہ سب کیوں کیا؟ پہلے تو بی فاختہ نے ٹال مٹول کی کوشش کی لیکن پھر کبوتر کے بار بار اصرار کرنے پر بی فاختہ کا دل نرم ہو گیا اور اس نے اوّل تا آخر تمام کہانی سنا ڈالی جسے سن کے ٹامی کبوتر کو چالاک کوے پر بہت غصہ آیا اور وہ بی فاختہ سے مخاطب ہو کر بولا:

''دیکھو بی فاختہ! تم نے بغیر سوچے سمجھے کوے کی باتوں کا یقین کر لیا۔ تم ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتی، کوا تو ہماری دوستی سے بہت جلتا ہے اور وہ تمہارے ننھے منے بچوں کو کھانا چاہتا ہے۔ یہ سب اس نے ہماری دوستی تڑوانے کے لیے کیا تا کہ ہم الگ الگ ہو جائیں اور وہ موقع پا کر تمہارے بچوں کو لقمۂ اجل بنائے۔

ٹامی کبوتر مزید بولا: ''بی فاختہ تم ایسے ہی مجھ سے بدگمان ہو گئیں۔ دیکھو بی فاختہ بدگمانی میں آ کر بندہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جیسے تم نے بدگمان ہو کر اپنے مشکل وقت کے ساتھی کو چھوڑ دیا اور بدگمانی گناہ ہے۔ بی فاختہ تمہیں چاہیے تھا کہ تم ایک دفعہ مجھ سے پوچھ تو لیتی۔ تم نے تو مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہ کی اور بن بتائے یہاں چلی آئی۔ تمہیں پتا ہے میں کتنا پریشان ہوا اور تمہیں کتنا ڈھونڈا۔ کوے کی باتوں میں کبھی نہ آنا، وہ ہماری دوستی پر بہت حسد کرتا ہے اور حسد کرنے والے کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے کہ وہ دوسروں کو خوش دیکھ کر خود جلتا رہتا ہے۔'' ٹامی کبوتر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بی فاختہ اپنے کیے پر بہت نادم تھی۔ اس نے اپنے مخلص دوست سے معافی مانگی اور پھر ٹامی کبوتر، بی فاختہ اور اس کے بچے اپنے گھونسلے کی جانب اُڑ گئے جہاں انہوں نے ہمیشہ اکٹھے رہنا تھا کیوں کہ بی فاختہ اب جان گئی تھی کہ مخلص ساتھی کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتے، وہ ہمیشہ ساتھ نبھاتے ہیں۔

☆☆

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اگست کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور پر میرا گھر، احساس اور بادشاہ کی پسند، بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ماموں وائی فائی، چچا تیز گام، مسٹر لال بیگ، صوفی نیازمند، چچا حیرت اور انکل بدحواس کے بغیر رسالہ بالکل پھیکا لگتا ہے۔ آخر میں مَیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ 25 رمضان المبارک کو میرے دادا جان فوت ہو گئے تھے، ان کے لیے دعا کیجیے گا۔ (سارہ فاطمہ، میانوالی)

☆ **آپ کے دادا جان کے لیے دعائے خیر۔**

اس ماہ کا میگزین بہت پسند آیا۔ کہانیاں اور لطیفے بہت دل چسپ تھے۔ میری امی اور خالہ جان یہ رسالہ اپنے بچپن سے پڑھتی آ رہی ہیں۔ میں چوتھی جماعت کی طالبہ ہوں۔ میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل آتی ہوں۔ مجھے یہ رسالہ پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں لیکن خط پہلی مرتبہ لکھ رہی ہوں۔ میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح عروج پر رہے۔ (حمنہ عاشق، لاہور)

امید ہے کہ آپ اگلے شمارے کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ آپ جس طرح تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قومی امانت کی حفاظت کر رہے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ تین چار ماہ قبل ماہنامہ تعلیم و تربیت میں پہلی مرتبہ شرکت کی تھی۔ اب میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر دوبارہ شرکت کر رہا ہوں۔ میں نے میٹرک الحمدللہ فرسٹ ڈویژن سے پاس کر لیا ہے۔ ایک کہانی اور چند لطیفے ارسال کر رہا ہوں، ضرور شائع کیجیے گا۔ آپ کے شمارے کا انتظار رہے گا۔ (محمد زوہیب، کوہاٹ)

☆ **امتحان میں کام یابی پر آپ کو مبارک ہو۔**

تعلیم و تربیت پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ دعا ہے کہ آپ اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ (آمین) کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں جو میرا خط قبول نہیں کرتے۔ یہ میرا چھٹا خط ہے۔ اگر اسے بھی شائع نہ کیا تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں تین سال سے باقاعدگی سے رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی جہانیاں سے کیا دشمنی ہے جو یہاں 15 تاریخ کو رسالہ ملتا ہے۔ رسالہ لیٹ آنے کی وجہ سے ہم آپ کے انعامی مقابلوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔

☆ **ہماری بھرپور کوشش ہے کہ آپ سب کو میگزین بروقت مل جائے۔**

(محمد زبیر جمشید، خانیوال)

اگست کا شمارہ بہت زبردست رہا۔ میرا گھر اور مستقبل کا پاکستان زبردست کہانیاں ہیں۔ سلسلہ وار ناول بھی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا ہمیشہ کی طرح معلوماتی تھا۔ تعلیم و تربیت کے تمام سلسلے ہی زبردست ہیں۔ (مریم صدیقہ، گوجرانوالہ)

کیسے ہیں آپ؟ امید کرتی ہوں کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم ''عید'' مزے سے منا کر بالکل فٹ فاٹ ہو گی۔ اگست کا شمارہ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک پڑھا اور پڑھنے کا بہت مزہ آیا۔ ہمیشہ کی طرح ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی۔ سلسلہ ''میری بیاض سے'' اچھا ہے اور ''قندِ مکرر'' کے طور پر لکھی گئی کہانی بھی بہت پسند آئی۔ میرے میٹرک کے امتحان میں بہت اچھے نمبرز آئے ہیں۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میرے تعلیمی کیریئر کی کام یابی کے لیے دعا کیجیے گا۔ تعلیم و تربیت کو میری اور میرے بھائی کی طرف سے یوم آزادی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ پیارے پاکستان کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ (آمین) (کرن فاروق، گوجرانوالہ)

آپ سب کو گزشتہ عید مبارک ہو۔ میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں مگر کبھی خط نہیں لکھا۔ اگست کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ بادشاہ کی پسند، معلومات عامہ، ناول دولت پور میں، زبردست تھا۔ میرا مشورہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے صفحات بڑھا دینے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی دے۔ آمین (ریشا نور، اسلام آباد)

ارے ہمیں بھی تعلیم و تربیت کی محفل میں گھسنے دیں۔ ویسے ہم پہلی دفعہ ہی گھس رہے ہیں۔ میرا نام جویریہ ہے۔ میں نے ایک کہانی ''بادشاہت کا تاج'' بھیجی ہے اچھی لگے تو ضرور شائع کیجیے گا۔ میری لکھائی اور غلطیوں کی وجہ سے آپ کو میرا خط اور کہانی پڑھنے

میں مشکل تو ہو گی، پر کیا کریں جی ہماری لکھائی ہے ہی ایسی، اس لیے معذرت۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا جا رہا ہے۔ ناول ''دولت پور میں'' بھی بہت پسند آیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے اور آپ اسی طرح اس رسالے کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔ (آمین) (جویریہ ادریس)

☆ **آپ کی کہانی نا قابلِ اشاعت ہے۔ مزید کہانیاں بھیجیں۔**

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میں تین سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں اور خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے اچھا اور بہتر ہے۔ ہم سب اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ شمارے کے صفحات اور سرورق بھی بہت اچھے ہیں۔ میرا خط ضرور شائع کریں کیوں کہ میں نے پہلی بار لکھا ہے۔ میں باقی سلسلوں میں بھی حصہ لینا چاہتی ہوں مگر مجھے ان کی معلومات چاہیے۔

(فائقہ عابد، حافظ حذیفہ عابد، قصور)

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کی پوری ٹیم ٹھیک ٹھاک ہو گی۔ تعلیم و تربیت کا اگست کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سلسلہ وار کہانی دولت پور میں اور احساس تو سپرہٹ ہیں۔ میرا گھر اور مستقبل کا پاکستان بھی بہت زبردست تھیں۔ اور ہاں کیا میرا صرف نام ہی شائع ہوتا رہے گا کہ کبھی اس اپنے خادم کا خط بھی شائع کریں گے؟ (قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ)

☆ **آپ کا خط شائع کر دیا، اب آپ خوش ہیں؟**

آپ کا کیا حال ہے؟ اگست کا شمارہ بہت منفرد تھا۔ میں ایک سال سے تعلیم و تربیت کا خاموش قاری ہوں لیکن آج میں خط لکھ رہا ہوں۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ کیا ہم بلاعنوان کے ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اگلا شمارہ اس سے بھی اچھا ہو گا۔

(حافظ محمد منیب، وزیر آباد)

☆ **جی ہاں! آپ ایک سے زیادہ عنوانات بھیج سکتے ہیں۔**

آپ کو چوتھی بار خط بھیج رہا ہوں لیکن ہر شمارے میں اپنا خط نہ پا کر مایوس ہو جاتا ہوں۔ ایڈیٹر صاحب! میں نے تعلیم و تربیت میں پانچ ماہ پہلے دو کہانیاں بھیجی تھیں جن میں سے ابھی تک کوئی بھی شائع نہیں ہوئی۔ اگر نا قابلِ اشاعت ہیں تو پلیز مجھے اس خط کے نیچے جواب لکھ دیں۔ اگست کے شمارے کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ ہمارے سبز ہلالی پرچم کی تصویر مینارِ پاکستان کے ساتھ خوب اچھی لگی۔ حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسول مقبول پڑھنے کے بعد ہم ایڈیٹر کی ڈاک پر پہنچے جہاں قارئین مختصر مگر جامع خطوط لیے حاضر تھے۔ کہانیوں میں میرا گھر، مستقبل کا پاکستان، وہ ہار کر بھی جیت گیا، نے خوب رنگ جمایا۔ سلسلے وار ناول دولت پور میں بھی اچھا لگا۔ محاورہ کہانی بھی تجسس سے بھرپور تھی۔ کھوج لگائیے کا جواب اس بار آسان تھا۔ سو ہم بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین) (محمد فیصل ابراہیم، ملتان)

میں چار سال سے تعلیم و تربیت کی قاری ہوں مگر خط و کتابت کا سلسلہ پچھلے دو سال سے شروع ہوا ہے۔ میں آپ کو کہانی بھیج رہی ہوں، امید ہے کہ میری کہانی آپ کے معیار پر پورا اُترے گی۔

(آمنہ اکبر گوندل، سرگودھا)

اگست 2014ء کا شمارہ زبردست رہا۔ کہانیوں میں احساس، درد اور مستقبل کا پاکستان بہت پسند آئیں۔ جولائی کے شمارہ میں اپنا خط شائع نہ ہونے پر مایوسی ہوئی۔ پلیز! اس شمارے میں ہمارے خط کو جگہ ضرور دیجیے گا۔ (محمد ضیاء اللہ، شمائلہ ناز، میانوالی)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

صباحت احمد، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ جویریہ یونس، لاہور۔ محمد حسین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ معز احمد، گجرات۔ محمد علیان جاوید، سرگودھا۔ عریشہ بتول، راولپنڈی۔ محمد افضل انصاری، لاہور۔ عظیم ڈوگر، ملتان۔ وجیہہ خلیل، گوجرانوالہ۔ محمد مہدی اکبر غوری، بھکر۔ الیشع طارق، گوجرانوالہ۔ ثمینہ آفریدی، نایاب آفریدی، پشاور۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ صفا رشید، کراچی۔ میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عشیاء نور، سیالکوٹ۔ لائبہ ریاض، لاہور۔ سحر فاطمہ، لاہور۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ اقراء عرفان، رمشہ عرفان، کوٹ مومن۔ لائبہ کنول، پشاور۔ زینب بنتِ اسلام، فیصل آباد۔ نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ۔ کشف طاہر، لاہور۔ فاطمہ عبداللہ، صوفیہ عبداللہ، پشاور۔ صبیح الحسن، سیالکوٹ۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ انعم طارق، شیخوپورہ۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ ایمن بنتِ حبیب اللہ، ملتان۔ محمد اجمل انصاری، چوہنگ۔ ماہ رخ ناصر، سرگودھا۔ امیرہ، عبیرہ، عیشل، دعا، سمعیہ، راولپنڈی۔ عبدالجبار انصاری، لاہور۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ ایمان علی، راولپنڈی۔ پلوشہ خٹک، پشاور

آفتاب احمد

شاہ فیصل مسجد

شاہ فیصل مسجد پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں قائم ایک عظیم الشان عبادت گاہ ہے جسے جنوبی ایشیاء کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ مسجد اپنے انوکھے طرزِ تعمیر کے باعث تمام مسلم دُنیا میں مشہور و معروف ہے۔ شاہ فیصل مسجد کی تعمیر کی تحریک سعودی فرماں روا شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے 1966ء کے اپنے دورۂ اسلام آباد میں دی۔ جب سعودی عرب کے شاہ فیصل نے 1966ء میں دورہ کیا تو انہوں نے مسجد کے تمام تعمیراتی اخراجات برداشت کرنے کی پیش کش کی۔ شاہ فیصل کے جذبے سے متاثر ہو کر پاکستان نے مسجد کو ان کے نام سے منسوب کیا۔

1969ء میں ایک بین الاقوامی مقابلہ منعقد کروایا گیا جس میں 17 ممالک کے 43 ماہرفنِ تعمیر نے اپنے نمونے پیش کیے۔ چار روزہ مباحثہ کے بعد ترکی کے ویدت دالوکے(Vedat Dalokay) کا پیش کردہ نمونہ پیش کیا گیا۔ پہلے پہل نمونے کو روایتی مسجدوں، محرابوں اور گنبدوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا لیکن مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں مسجد کی خوب صورت تعمیر نے تمام نقادوں کی زبان گنگ کر دی۔ مسجد کا سنگِ بنیاد اکتوبر 1976ء میں اس وقت کے فرماں روا شاہ خالد نے رکھا۔ سعودی حکومت کی مدد سے دس لاکھ سعودی ریال (تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ امریکی ڈالر) کی لاگت سے 1976ء میں مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ تعمیراتی اخراجات میں بڑا حصہ دینے پر مسجد اور کراچی کی اہم ترین شاہراہ 1975ء میں شاہ فیصل کی وفات کے بعد ان کے نام سے منسوب کر دی گئی۔ 1984ء میں یہ مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی اور جون 1988ء میں یہاں نماز پنجگانہ کی ابتداء ہوئی۔

مسجد شاہراہ اسلام آباد کے اختتام پر واقع ہے جو شہر کے آخری سرے پر مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک خوب صورت منظر پیش کرتی ہے۔ یہ اسلام آباد کے لیے ایک مرکز اور شہر کی سب سے مشہور پہچان ہے۔

دُور سے دیکھنے سے یہ خیمہ نما عمارت معلوم ہوتی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ نے نماز کا پہلا اجتماع بھی خیمے میں کیا تھا۔ فیصل مسجد کا رقبہ 189705 مربع میٹر (146.87 ایکڑ) ہے جب کہ اس کا مرکزی ہال 5155 مربع میٹر (625 ایکڑ) پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ مرکزی ہال 72 میٹر چوڑا اور 72 میٹر

لمبا ہے۔ مرکزی ہال بغیر کسی ستون کے کھڑا ہے۔ مرکزی ہال میں دس ہزار نمازی جب کہ بیرونی احاطہ کو شامل کر کے مسجد کے دیگر حصوں اور لان میں تین لاکھ افراد نماز کی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر 285 فٹ بلند مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ دُنیا کی بڑی مسجدوں میں سے ایک اور برصغیر کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ فنِ تعمیر جدید ہے لیکن ساتھ ہی روایتی عربی فنِ تعمیر کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک بڑا تکونی خیمے اور چار میناروں پرمشتمل ہے۔ روایتی مسجدی نمونوں سے مختلف اس میں کوئی گنبد نہیں ہے اور ایک خیمہ کی طرح مرکزی عبادت گاہ کو چار میناروں سے سہارا دیا گیا ہے۔ مینار ترکی فن تعمیر کے بھی عکاس ہیں جو عام مینار کے مقابلے میں باریک ہیں۔ چاروں کونوں پر میناروں کی بلندی 285 فٹ ہے۔ 190 فٹ کی بلندی پر ایک گیلری بھی تعمیر کی گئی ہے، اس گیلری سے پورے اسلام آباد شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

مسجد کے ہر مینار کو سنہری ہلال سے سجایا گیا ہے اور وسط میں بڑا ہلال بھی نصب کیا گیا ہے۔ بڑے ہلال کا وزن ڈیڑھ ٹن ہے اور قطر سوا تیرہ میٹر، یہ پون انچ موٹی چادر سے بنایا گیا ہے۔

محراب کو کھلی کتاب کی شکل دی گئی ہے جس کے صفحات کے حاشیوں پر اللہ تعالیٰ کے 99 نام کندہ ہیں۔ مرکزی ہال میں جو خوب صورت فانوس لٹکایا گیا ہے، اس کا وزن ساڑھے چھ ٹن ہے۔ یہ فانوس تقریباً ایک ہزار برقی قمقموں سے مزین ہے۔ مشہورِ زمانہ پاکستانی خطاط صادقین نے دیواروں پر پچی کاری کے ذریعے قرآنی آیات تحریر کی ہیں جو فنِ خطاطی کا عظیم شاہکار ہیں۔ پچی کاری مغربی دیوار سے شروع ہوتی ہے جہاں خطِ کوفی میں کلمہ لکھا گیا ہے۔ مسجد کی تعمیر عرصہ دراز سے ہونے والے جنوبی ایشیائی

مسلم فنِ تعمیر سے مختلف ہے اور کئی انداز سے روایتی عربی، ترکی اور ہندی طرزِ تعمیر کا امتزاج ظاہر کرتا ہے۔ مسجد میں خواتین کے لیے نماز ادا کرنے کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ مرکزی دروازے کے ساتھ وضو خانے میں بیک وقت دو سو افراد وضو کر سکتے ہیں۔

1980ء میں فیصل مسجد ہی میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس میں تمام علوم اسلامیہ کے علاوہ مروجہ علوم میں بھی تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ بعدازاں اسے الگ مقام پر منتقل کرا دیا گیا۔ فیصل مسجد میں ایک خوب صورت لائبریری بھی ہے۔ 17 اگست 1988ء کو جب جنرل ضیاء الحق اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ بہاول پور میں ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تو انہیں فیصل مسجد کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ بعدازاں ان کا مزار بھی بنا دیا گیا۔

اس مسجد کا ذکر گینز بک آف ریکارڈ کی 1999ء کی اشاعت میں بھی دُنیا کی سب سے بڑی مسجد کی حیثیت سے کیا گیا ہے جو کہ عالمِ اسلام اور پاکستان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

☆☆☆

اذان

احمد عدنان طارق

بڑے بڑے پہاڑوں کے درمیان وادی میں باقری کا گاؤں تھا۔ باقری دس سال کا لڑکا تھا۔ دُور دُور تک باقری کے گاؤں کے علاوہ کوئی اور گاؤں نہیں تھا مگر اس گاؤں کی سب سے اچھی بات یہاں کی خاموشی اور لوگوں کی امن پسندی تھی۔ اس خاموشی کو منتشر کرنے والی صرف ایک شوریدہ ندی تھی۔ جو پہاڑوں سے بہت تیزی سے چھینٹے اُڑاتی، لہراتی، بل کھاتی عین گاؤں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ رات کو بستر میں لیٹے ہوئے گاؤں والے اس کی اٹھکیلیوں کی آواز صاف سن سکتے تھے لیکن گاؤں میں رہنے والے ہر علی الصبح ایک اور آواز بھی سننے کے عادی ہو چکے تھے اور وہ آواز ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ یہ مسجد کی منبروں سے گونجتی ہوئی اذان کی آواز تھی جو لوگوں کو نماز کے لیے دعوت دیتی تھی۔

یہ باقری کے دادا جان کی آواز تھی اور اس کی گونج آسمانوں تک جاتی تھی۔ یہ ندی کے کنارے بنی ہوئی مسجد کے مؤذن تھے۔ اذان دینا باقری کے دادا کا معمول تھا اور انہوں نے کبھی اس فرض سے کوتاہی نہیں برتی تھی لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب یہ آواز مسجد میں صبح صبح سنائی نہیں دی۔ باقری بہت حیران تھا لیکن اسے پریشانی بھی ہو رہی تھی کہ کچھ مسئلہ نہ ہو گیا۔ ہو کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گئے؟

پہلے باقری نے سوچا کہ مسجد میں نماز پڑھنے کے بجائے دادا جان کا پتا کرے کہ ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا ہے لیکن پھر اسے شرم آنے لگی کہ نماز کے بغیر اس کا دن کیسے شروع ہو سکتا ہے۔ اسے امید بھی تھی کہ مسجد میں کوئی نہ کوئی اسے دادا جان کے متعلق ضرور بتائے گا۔ مسجد میں بھی اس کی نظریں دادا جان کو ہی ڈھونڈتی رہیں لیکن ان کا کہیں پتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے ان کی خیریت کے بارے میں بتایا۔ کیا وہ گھر پر ہیں اور بیمار ہیں؟ باقری سوچ رہا تھا کہ نماز شروع ہو گئی۔ باقری اپنی سوچوں پر قابو پا کر نماز کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن ابھی بھی اس کے ذہن میں خدشات تھے۔ نماز کے بعد وہ دادا جان کے گھر کی طرف چلا مگر راستے میں کچھ سوچ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے دادا جان کے پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے اور یہ سال کے وہ دن تھے جب سب لڑکے درختوں سے گرے ہوئے اخروٹ اکٹھے کیا کرتے تھے۔

اخروٹ کی گری اس کے دادا جان کو بہت پسند تھی۔ اس نے سوچا کہ دادا جان کی خیریت پوچھنے سے پہلے اسے اخروٹ اکٹھے کرنے چاہئیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے قریبی پہاڑی پر جانے والے راستے پر دوڑ لگا دی۔ راستہ دھند کی وجہ سے اسے کم ہی نظر آ

رہا تھا۔ پہاڑی پر تناور اخروٹ کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان پر بہترین اخروٹ تھے۔ شدید سردی تھی مگر باقری نے بہت گرم شال اوڑھ رکھی تھی کیوں کہ صبح صبح وہ نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا۔ اس نے شال کو سنبھالا اور پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ دادا جان اخروٹ بہت پسند کریں گے لیکن اس سے پہلے مسئلہ انہیں چننے کا تھا۔ اخروٹ کے خول بہت سخت ہوتے ہیں مگر ان کے دادا ان خولوں کو پیس کر دوا بناتے تھے جو پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اخروٹوں کی گری وہ خود کھائیں گے اور دوائی بیچ کر روپے بھی کما لیں گے۔ اگر اسے بہت زیادہ اخروٹ مل گئے تو ان سے کتنی دوائی بنے گی اور کتنے روپے کمائے جا سکیں گے؟ ظاہر ہے دادا جان اخروٹوں کو پا کر اتنے خوش ہوں گے کہ فوراً صحت یاب ہو جائیں گے۔ پھر اس نے اخروٹوں کی نسبت سے روپوں کا اندازہ لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ دوڑتا بھی رہا اور انگلیوں پر حساب کتاب بھی کرتا رہا مگر ہر دفعہ بھول جاتا۔ وہ ابھی صرف چوتھی جماعت کا طالب علم تھا، اسے حساب میں غلطی ہو سکتی تھی مگر وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ دادا جان کو کیسے خوش کر سکتا ہے۔

باقری خوشی خوشی دوڑ رہا تھا لیکن اچانک ایک خیال ذہن میں آنے سے وہ رُک گیا۔ اس نے سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کے پہاڑی پر پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں کے دوسرے لڑکے اخروٹوں تک پہنچ جائیں اور اس سے پہلے ہی اخروٹ چن لیں جو رات کو زمین پر گرے ہوئے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ وہ جیسے ہی پہاڑی کے بالکل نیچے پہنچا تو سورج طلوع ہونا شروع ہو گیا جس سے شفق کی لالی پورے آسمان پر پھیل گئی۔ وہ پہاڑی کے اوپر جانے والا راستہ تیزی سے عبور کرتا رہا۔ راستے میں اسے لومڑی کے بچے اِدھر اُدھر گشت کرتے ہوئے ملے۔ وہ بھی اس سے خائف ہو کر اپنے اپنے بھٹ میں گھس گئے جہاں اب انہیں سارا

دن سونا تھا۔ پہاڑی کے اوپر چڑھ کر وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ اس کی خوشی اور اطمینان کی انتہا نہیں تھی جب اس نے دیکھا کہ وہ پہلا لڑکا ہے جو پہاڑی پر چڑھا ہے، ابھی دُور دُور تک کوئی اور شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ اخروٹوں کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے اخروٹ خاصی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔ ساری رات بہت تیز اور سرد ہوا چلتی رہی جس کی وجہ سے درختوں سے زیادہ اخروٹ گرے تھے۔ باقری انہیں اپنی شال میں جمع کرنے لگا۔ اسے شال گندی ہونے کا افسوس تھا مگر اس کا ارادہ تھا کہ گھر جا کر وہ اسے دھو لے گا۔

پھر اچانک اس نے کچھ لڑکوں کے بولنے کی آوازیں سنیں، وہ پہاڑی کے اوپر آ رہے تھے۔ اسے سمجھ آ گئی کہ یہ گاؤں کے دوسرے لڑکے ہیں جو اخروٹ اکٹھے کرنے آئے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا کہ میں انہیں بتائے بغیر اکیلا ہی اخروٹ لینے آ گیا ہوں اور اخروٹ بھی اکٹھے کر لیے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ مجھ سے اخروٹ چھین لیں۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہو گی، اگر وہ میری ٹھکائی نہیں کریں گے۔ اس کے پاس صرف ایک ہی چارہ تھا کہ وہ لڑکوں کے اوپر آنے سے پہلے کہیں چھپ جائے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا

اور پھر ایک قریبی پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ اسے وہیں چھپے خاصی دیر ہوگئی اور وہ دعا مانگتا رہا کہ وہ اسے دیکھ نہ لیں۔ وہ پانچ لڑکے تھے جو چوٹی پر پہنچے اور وہ سبھی عمر میں اس سے بڑے تھے۔ لڑکوں نے درخت کے نیچے دیکھا تو پریشان ہو گئے کہ ایک بھی اخروٹ نیچے گرا ہوا نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے دیر سے آنے پر افسوس کر رہے تھے۔ انہیں قلق تھا کہ اتنا فاصلہ بھی طے کیا اور پھر بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آخر کون ان سے پہلے یہاں آ سکتا ہے؟

تب سب کے منہ سے باقری کا نام نکلا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ سب سے پہلے مسجد میں آتا ہے۔ اِدھر باقری سانس روکے پتھر کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ ایک جگہ لڑکوں نے باقری کے جوتوں کے نشان بھی زمین پر دیکھے تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہی سارے اخروٹ اکٹھے کر کے لے گیا ہے۔ ایک لڑکے نے مشورہ دیا کہ ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا، ہم راستے میں ہی اس سے اخروٹ چھین سکتے ہیں لیکن سب سے بڑے لڑکے نے اسے یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا کہ باقری ہم سب سے پہلے جاگ کر مسجد میں نماز پڑھنے آتا ہے۔ اس وقت ہم ابھی بستر پر پڑے اینٹھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ اخروٹ اس کا حق ہیں۔ اگر ہمیں بھی اخروٹ چاہئیں تو ہمیں صبح سویرے اُٹھنا چاہیے، بجائے اس کے کہ ہم اس سے اخروٹ چھیننے کا سوچیں۔ پھر وہ بولنا بند ہو گئے اور خاموشی سے پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے۔ پتھر کے پیچھے چھپا ہوا باقری یہ بات سن کر بہت متاثر ہوا۔ ایک طرف تو وہ خدا کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ انہوں نے اسے نہیں دیکھا اور دوسری طرف اسے لڑکوں سے ہمدردی بھی تھی کیوں کہ وہ مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے۔

آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ پتھر کے پیچھے سے باہر نکلا اور لڑکوں کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ لڑکے اس کی آواز سن کر مُڑے اور اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ باقری ان کے قریب پہنچ کر ان سے معذرت کرنے لگا کہ اس نے سارے اخروٹ خود ہی اکٹھے کر لیے۔ وہ چاہتا تھا کہ اچھے دوستوں کی طرح وہ یہ اخروٹ بانٹ لیں لیکن بڑے لڑکے نے باقری کو شکریہ کہتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے اخروٹ ہیں۔ باقری نے محبت سے بڑے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور اسے بتایا کہ اس کے دادا جان نے صبح نماز کے لیے اذان نہیں دی تو وہ ان کے لیے اخروٹ لے کر جا رہا تھا لیکن اسے امید ہے کہ وہ صرف اس کے حصے سے بھی خوش ہو جائیں گے۔

ایک لڑکے نے یہ بات سن کر باقری کو بتایا کہ صبح اس کے دادا جان گاؤں کے کسی آدمی سے ملے تھے۔ انہیں سردی سے بخار ہے لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو کر مسجد میں آ جائیں گے۔ تب اچانک بڑا لڑکا بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے تو پھر ہم سب یہ اخروٹ بانٹ لیتے ہیں اور سبھی جا کر اپنا اپنا حصہ دادا جان کو دیتے ہیں۔ تب وہ خوش ہو کر جلد صحت یاب ہو جائیں گے اور ہم ان کی خوب صورت اذان کی آواز دوبارہ وادی میں گونجتی ہوئی سنیں گے۔''

یہ فیصلہ کرنے کے بعد تمام لڑکے ایک دوسرے کو چھیڑتے، خوش گپیاں مارتے پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے۔ موسم بھی اب صاف ہو گیا تھا۔ دھند چھٹ گئی تھی اور ان سب لڑکوں کا رُخ باقری کے دادا جان کے گھر کی طرف تھا۔ ☆☆☆

سجدہ تلاوت کا بیان

قرآن کریم میں چند مقام ایسے آتے ہیں جن کے پڑھنے یا کسی کو پڑھتے ہوئے سننے سے سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، اسے سجدہ تلاوت کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں چودہ مقامات ہیں جن کو چودہ سجدے بھی کہتے ہیں۔ جب سجدے کی آیت پڑھ لی جائے تو بہتر ہے کہ اسی وقت سجدہ کر لیا جائے، زیادہ تاخیر مکروہ ہے۔ نماز سے باہر سجدہ کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر تکبیر کہتا ہوا سجدہ کرے اور پھر تکبیر کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہو لیکن اگر بیٹھے ہی سجدہ میں گیا اور سجدہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب بھی سجدہ ادا ہو گیا۔ سجدہ تلاوت کی وہی شرائط ہیں جو نماز کی ہیں۔ سجدہ تلاوت انہیں چیزوں سے فاسد ہوتا ہے جن چیزوں سے نماز فاسد ہوتی ہے۔ اگر سجدہ کی کوئی خاص آیت ایک مجلس میں دو یا زیادہ مرتبہ پڑھے یا سنے تو ایک ہی سجدہ واجب ہے۔ اگر ایک مجلس میں جتنی مختلف سجدوں کی آیتیں پڑھیں یا ایک آیت جتنی مجلسوں میں بار بار پڑھی ہے، اتنے سجدے واجب ہوں گے۔ اگر قرآن پڑھتے وقت آگے پیچھے سے پڑھ لے اور صرف آیت سجدہ چھوڑ دے تو ایسا کرنا مکروہ ہے۔ جہاں زیادہ لوگ بیٹھے ہوں تو سجدہ کی آیت بہتر ہے کہ آہستہ پڑھے۔

دنیا کے خطرناک ترین کھیلوں میں ''بُل فائٹنگ'' کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ہر سال ہزاروں بُل یا سانڈ کھیل تماشے کے نام پر بے دردی سے زخمی کیے جاتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی بچانے کے لیے تفریحِ طبع کی خاطر لڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر اس خونی کھیل میں خون کے مزید رنگ بھرنے کے لیے انھیں خواہ مخواہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو بُل فائٹنگ ایک وحشیانہ کھیل ہے، جس میں حضرت انسان کا مقابلہ ایک جانور کے ساتھ ہوتا ہے، جس میں عام طور پر شکست جانور کو ہوتی ہے اور اس سے کہیں کم زور انسان جیت کا تمغہ سینے پر سجائے اسٹیڈیم کے چکر کاٹتا ہے اور ساری دُنیا کو بتاتا ہے کہ اس نے وحشی جانور کو شکست دے دی۔ لوگوں کے نزدیک بُل فائٹنگ ایک کھیل ہے، ایک تماشا اور ایک آرٹ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ظالمانہ اور خونی کھیل ہے، جس کی وجہ سے ایک مظلوم جانور بے تحاشا زخمی ہو جاتا ہے۔ اس کا خون ناحق بہتا ہے اور اکثر وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ دُنیا بھر میں بُل فائٹنگ مختلف شکلوں اور قسموں میں ہوتی ہے۔ اسپین، پرتگال، فرانس، میکسیکو، کولمبیا، وینزویلا، پیرو، گوئٹے مالا اور اب ریاست متحدہ امریکا میں بھی یہ کھیل بڑی باقاعدگی اور تواتر سے کھیلا جانے لگا ہے۔

میٹوڈور (Matadore) اس کھلاڑی کو کہتے ہیں جو سانڈ کے ساتھ میدان میں اتر کر بُل فائٹنگ کا خونی کھیل کھیلتا ہے۔ اسے پرتگیزی زبان میں Toureiros کہتے ہیں۔ اس کھیل کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ میٹوڈور ابتدا میں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں اور بڑے اعتماد کے ساتھ سانڈ کو اپنی جانب راغب کرتا ہے کہ وہ اس کی طرف آئے اور اس پر حملہ کرے۔ اس دوران میٹوڈور پوری مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتا ہے اور کھیل کے دوران سانڈ پر حاوی نظر آتا ہے۔ کھیل کے دوران وہ سانڈ کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ یہ کھیل ایسے ہی جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ مقام آن پہنچتا ہے کہ اسپینی طرز کے مطابق میٹوڈور سانڈ کے جسم میں تلوار گھونپ کر اس کا خاتمہ کر دیتا ہے اور اس طرح ایک معصوم جانور کھیل تماشے کے نام پر اپنے ہی خون میں نہا جاتا ہے اور تماشائی اس انوکھی خون ریزی پر خوب تالیاں بجاتے ہیں اور میٹوڈور کو اس کی ہمت اور شجاعت پر داد دیتے ہیں۔

بُل فائٹنگ کے مختلف اسٹائل ہیں۔ بعض ملکوں میں بُل فائٹنگ

ایک روایتی کھیل ہے جس کے مختلف اسٹائل ہیں، لیکن تین خاص اسٹائل اسپینی، فرانسیسی اور پرتگیزی ہیں۔ ان تمام اقسام میں سانڈوں (بیلوں اور گایوں) کو تھکا کر اور پریشان کر کے زخمی کرنا یا جان سے مار ڈالنا شامل ہے۔ ان میں سے بعض کھیلوں میں سانڈوں کو صرف تھکا یا زخمی کیا جاتا ہے اس لیے انھیں بڑے فخر سے "بلڈ لیس بل فائٹنگ" کہتے ہیں۔ بل فائٹنگ کسی بھی قسم کی ہو، اس کی کوئی بھی شکل ہو، وہ ہر صورت میں اس کھیل میں شامل جانوروں کے لیے اذیت اور موت کا سبب ہے۔

اسپین کی بل فائٹنگ سب سے مشکل اور پیچیدہ ہے، جس میں سانڈ میدان میں داخل ہوتا ہے، پھر اسے دوڑا دوڑا کر تھکایا جاتا ہے اور غصہ دلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک گھڑ سوار میدان میں داخل ہوتا ہے، جس کے گھوڑے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ اس گھڑ سوار کے ہاتھ میں ایک نوک دار بھالا ہوتا ہے، جس سے وہ سانڈ کی پشت اور گردن کے عضلات پر حملے کرتا ہے۔ سانڈ اس وقت اپنے خون میں نہا جاتا ہے اور اتنا زخمی ہو جاتا ہے کہ اپنا دفاع کرنے کے لیے اپنا سر بھی نہیں اُٹھا پاتا۔ ہاتھ میں رنگ برنگی نوک دار چھڑیاں ہوتی ہیں، جس کی نوکیں خنجر کی نوکوں کی طرح بہت تیز ہوتی ہیں۔ یہ چھڑیاں بُل فائٹرز سامنے کھڑے خوں خوار سانڈ کے جسم میں اور خاص طور سے اس کی پشت میں گھونپتی ہوتی ہیں، تاکہ وہ درد اور تکلیف سے بے قابو ہو کر میدان میں اِدھر اُدھر دوڑے اور تماشائیوں کو تفریح میسر آئے اور وہ خوب لطف اندوز ہوں۔

شروع میں تو سانڈ خود کو ان نوکیلی چھڑیوں سے بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا ہے۔ وہ بار بار بل فائٹر پر بھی حملہ کرتا ہے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اس کی ساری جدوجہد دم توڑ دیتی ہے۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی پشت پر ان چھڑیوں کا ڈھیر سا لگ جاتا ہے جو سب کی سب اس کی کمر میں پیوست ہوتی ہیں۔ پھر وہ جھومتے جھومتے لڑکھڑانے لگتا ہے۔ بل فائٹر اس کی کمزوری کو بھانپ لیتا ہے اور آخری حکمت عملی یہ اختیار کرتا ہے کہ اس پر پے در پے حملے کرنے لگتا ہے، جس سے کمزور و لاغر جانور پریشان بلکہ ہراساں ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر بُل فائٹر اپنی تلوار سانڈ کے جسم میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تلوار نشانے پر نہیں لگتی تو بل فائٹر سانڈ کی گردن اور پشت پر خنجر سے وار کرتا ہے، یہاں تک کہ معصوم جانور مفلوج اور بے حس ہو جاتا ہے۔ خنجر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں موجود حرام مغز کو کاٹ دیتا ہے لیکن یہاں بھی بل فائٹر سے غلطی ہو سکتی ہے اور اس کا نشانہ چوک سکتا ہے کیوں کہ بعض اوقات سانڈ اس حد تک زخمی ہونے کے بعد بھی پوری طرح ہوش و حواس میں ہوتا ہے، چناں چہ بل فائٹر اس کی دم یا کان کاٹ لیتا ہے، جو بعد میں جیت کی ٹرافی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد سانڈ کو نیم مردہ حالت میں رِنگ سے گھسیٹ کر باہر لے جایا جاتا ہے، جہاں اس کے جسم کے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت فوڈ مارکیٹ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بُل فائٹنگ ناپسندیدہ کھیل بھی مانا جاتا ہے کیوں کہ سانڈ یا بیل جان دار ہیں، وہ بھی جذبات و احسات رکھتے ہیں اور انھیں بھی غصہ آتا ہے۔ جب انھیں پالنے والے ان کی نگہداشت کرنے والے، زبردستی انھیں میدان میں اتارتے ہیں، جہاں یہ معصوم جانور یہ انوکھا منظر دیکھتے ہیں کہ انھیں ستایا جا رہا ہے، اشتعال دیا جا رہا ہے۔ جانور اپنے نگہبانوں کی طرف دیکھتے ہیں، جنھوں نے ان کی پرورش کی ہے، مگر اس میں جیت کی چمک ہوتی ہے۔ پھر ان جانوروں کو تھکا تھکا کر اس حد تک نڈھال کر دیا جاتا ہے کہ ان میں اپنی جان بچانے کے لیے جدوجہد کی سکت بھی نہیں رہتی اور بالآخر وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

بُل فائٹنگ کوئی ایمان دارانہ لڑائی نہیں ہے۔ یہ لڑائی ایک اکیلے سانڈ اور متعدد انسانوں کے درمیان ہوتی ہے، جو گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان سانڈوں کو لڑائی سے پہلے یا تو نشہ آور دوائیں دی جاتی ہیں یا ان کے سینگوں کو کاٹ یا گھس دیا جاتا ہے۔ اس سے سانڈوں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ بُل فائٹنگ کے ان مقابلوں میں صرف سانڈ ہی ہلاک نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس وحشیانہ کھیل میں شریک گھوڑے بھی مارے جاتے ہیں اور انسان بھی۔

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ ستمبر 2014ء ہے۔
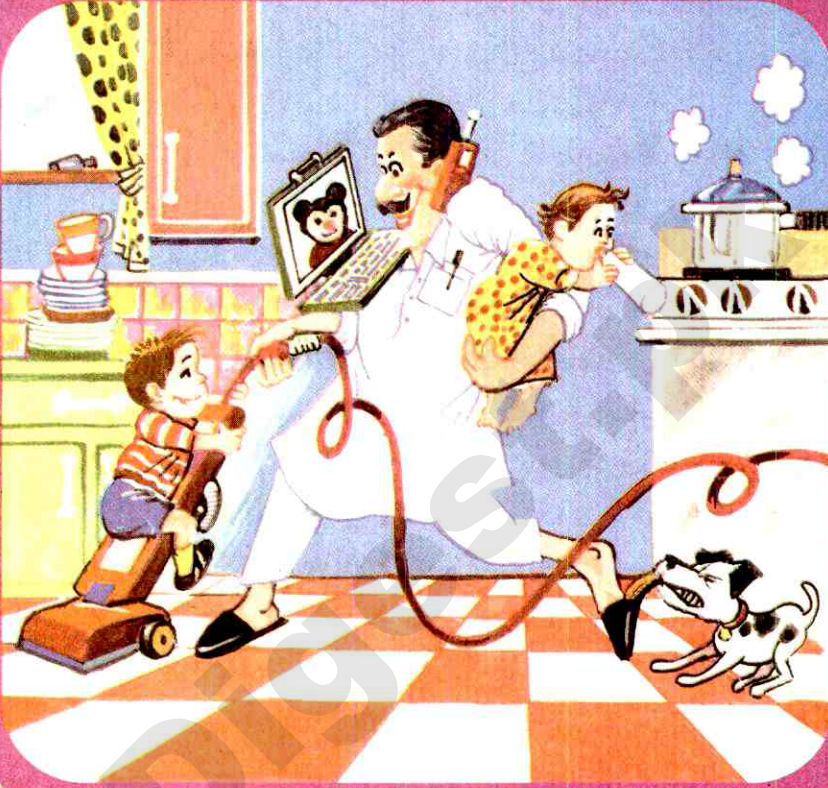
اگست 2014ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔
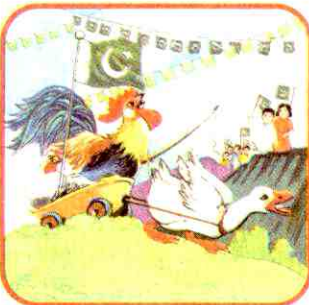
- کاروانِ آزادی کی اب چل پڑی اسپیشل گاڑی (فاطمہ اعتزاز، اٹک)
- تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے
  اس پہ دل قربان اس پر جان بھی قربان ہے (فلک بن ندیم، حیدر آباد)
- جشنِ آزادی آیا ہے، ہر طرف خوشیاں لایا ہے (محمد زین العابدین، فیصل آباد)
- جگ جگ جیوے میرا پیارا وطن، لب پہ دعا ہے دل میں لگن (مریم نور، لاہور)
- آزادی کا جشن منائیں گے، وطن کو ہم سجائیں گے (اقصیٰ شہزادی، گوجرانوالہ)

نونہال مصور
یوم آزادی
تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔
PaKIsTAN ZINDA BAD.
یوم آزادی مبارک
نرمل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)
یوم آزادی
انعم نوشین، فیصل آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)
امبر اشرف اعوان، لاہور کینٹ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)
یوم آزادی مبارک
Long Live PAKISTAN.
آمنہ ظفر، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)
حفصہ ہارون، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)
کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عظیم ڈوگر، ملتان۔ خدیجہ عابد، جھنگ صدر۔ عریشہ بتول، راول پنڈی۔ آصف علی، لاہور۔ کشف طاہر، لاہور۔ فصیحہ آفرین، کراچی۔ وجاہت رسول، بہاول پور۔ صفا رشید، کراچی۔ محمد عبداللہ ثاقب میر، پشاور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ لائبہ ہاشمی، راول پنڈی۔ حسیب الرحمٰن، شیخوپورہ۔ صوفیہ عبداللہ، فاطمہ عبداللہ، پشاور۔ حسان علی، لاہور۔ ربیعہ آفتاب، ایبٹ آباد۔ مریم عمر، گلزار قائد کیمپس۔ عدن سجاد، جھنگ۔ آمنہ کامران، سرگودھا۔ صبیح الرحمٰن، لاہور۔ زینب بنتِ اسلام، فیصل آباد۔ نبیل حسن، گجرات۔ بہاول پور۔ عبداللہ غازی، گوجرانوالہ۔ مشال آصف، پشاور۔ جویریہ یونس، لاہور۔ محمد زین العابدین شاہ، خانپور۔ نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔
ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔
اکتوبر کا موضوع
سبزی فروش
آخری تاریخ 8 اکتوبر
ستمبر کا موضوع
فوجی پریڈ
آخری تاریخ 8 ستمبر